Regd. No. A655

بندوق پستول ریوالور
اور کارتوس وغیرہ
اعلیٰ پایہ کی
مرمت
کا مکمل انتظام
تھوک و پرچون
باوا بُرد من سنگ اینڈ سنز کلاتھ مارکیٹ دہلی

چندن
ساحر ہوشیارپوری
نریش کمار شاد

زندگی اور ادب کے صحت مند شعور کا ترجمان

ترتیب دینے والے:

ساحر ہوشیارپوری
نریش کمار شاد

شمارہ ۵

مارچ سنہ ۱۹۴۹ع

اُروشی پبلیکیشنز پوسٹ بکس ۳۰۴ کانپور

سالانہ قیمت آٹھ روپے
فی پرچہ بارہ آنے

۲۵۰ اڑھائی سو صفحے کی یہ ضخیم اور باتصویر کتاب

اُردو کلچر کی ایک مبسوط ذہنی تاریخ ہے

جس کی افادیت اور اہمیت کو اُردو کے کم و بیش ہر بڑے نقاد نے تسلیم کیا ہے۔
جس کا مطالعہ آپ کو زندگی اور ادب کے بڑھتے ہوئے میلانات سے روشناس کرائے گا۔
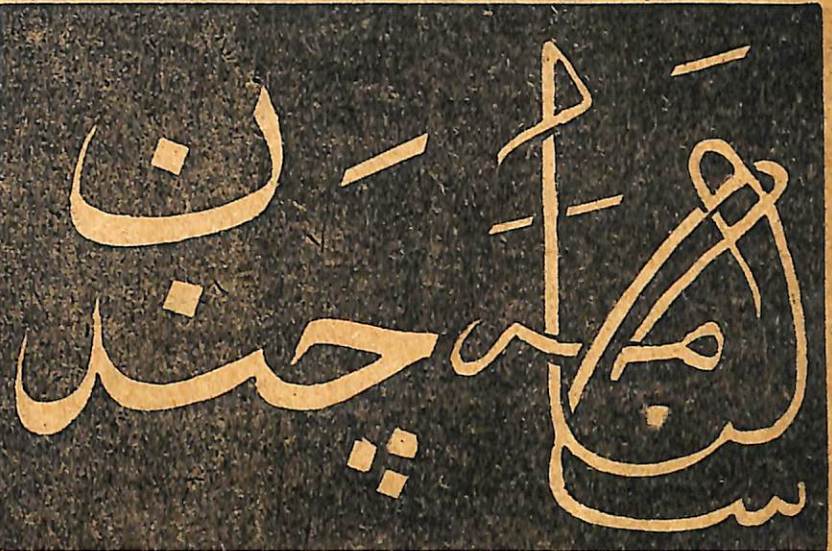
سنہ ۴۹ء جس میں دو شگفتہ فکر مصوروں کے شاہکار اور آپ کے متعدد
محبوب فن کاروں کی

عکسی تصاویر بھی شامل ہیں

قیمت:۔ دو روپئے
سالانہ:۔ آٹھ روپئے

جو حضرات سالانہ قیمت آٹھ روپئے اور تین روپئے رجسٹری خرچ ارسال فرمائیں گے وہ سال بھر کے عام پرچوں کے علاوہ یہ گراں قدر سالنامہ مفت حاصل کر سکتے ہیں۔

اُروشی پبلیکیشنز پوسٹ بکس ۳۰۴
کانپور

ترتیب

چندن

آئینہ

۱۷۱۴۸

نقشِ اول

فرانسیسی زبان کے سکالر محمد حسن صاحب عسکری ادیبوں کے فرائض بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ادیب کا کام تو یہ ہے کہ اپنے احساسات سے ایمانداری برتے۔ اس نے حقیقت کو جس طرح محسوس کیا ہو بالکل اسی طرح پیش کر دے اس سے بحث نہ رکھے کہ میری تحریروں سے انسانیت کا مستقبل سنوارنے میں مدد ملتی ہے یا نہیں۔

ظاہر ہے عسکری صاحب کا یہ فراری اور بیمار نظریہ ادب کے حق میں ایک غلیظ گالی سے کم نہیں۔ جب ادب انسانیت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے تو وہ اپنی چمکیلی اور دور رس نگاہیں انسانیت کے مستقبل سے کیونکر ہٹا سکتا ہے۔ دراصل اس بے جان نظریے میں فرانس کے موقع پرست ادیبوں کی فسطائی ذہنیت کی زہر آلود آواز لرز رہی ہے لیکن اس دم توڑتی ہوئی آواز میں کوئی تاثیر باقی نہیں رہی۔ کیونکہ آج کا ادیب صرف اپنے احساسات کے دائرے میں گم سُم رہ کر انسانیت کے مستقبل سے چشم پوشی کر کے ادب اور زندگی سے غداری نہیں کر سکتا۔

۱۹۴۷ء کی بہیمیت اور لرزہ خیز ہلاکت سے پہلے ہمارا ادب بہت حد تک اقتصادیات کے ارد گرد گھوم کر یا نفسیاتی اور جنسی گورکھ دھندوں میں اُلجھ کر ہی رہ جاتا تھا لیکن انسانیت کو مذہب اور سامراج کا گھن اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا اور جب حد بندیوں کے کمیشن کے اعلان نے اس پنجر کو دھڑام سے تہ و بالا کر دیا تو ہمارے ادیب چونک کر رہ گئے۔ شعور کی یہ بیداری انسانیت کے حق میں ایک نیک فال ثابت ہوئی۔ کیونکہ اب ادیبوں پر ادب کے نظریات بالکل واضح ہو گئے اور انہوں نے اس سچائی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ انسانی دوستی ہی ادب کا بنیادی عنصر ہے اور ادیب انسانی مستقبل سے غافل ہو کر ادب کو زندہ نہیں رکھ سکتا۔ انسانی حیات سے اس کی غفلت کا ایک لمحہ بھی منافقت کے دلدوز طوفانوں کو دعوت دے سکتا ہے۔

لیکن تعجب ہے کہ عسکری صاحب اب بھی اپنے اس غیر سنجیدہ اور کھوکھلے نعرے سے ادب اور انسانیت کے راستے میں چٹانیں حائل کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں کون سمجھائے کہ ہماری معاشرت ایک بہت بڑے تاریخی المیے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی ہے۔ زمین اور تمدن کی تقسیم نے عوام کی سماجی اور اقتصادی زندگی کے چہرے پر بھی خراشیں ڈال دی ہیں لیکن ہمارا ادب ان خراشوں کو دور کرنے سے غافل نہیں۔ ہمارے ادیب اب بھوک اور جنس کے جذباتی نعروں کے پیچاک سے نکل کر عوام کے ماحول میں سانس لے رہے ہیں اور اپنے سینوں میں ایک انوکھی اور پُر خلوص تڑپ لے کر انسانیت کی تباہ حالی پر اشکبار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے مکروہ خد و خال کو نکھارنے اور سنوارنے کا تاریخی فریضہ سرانجام دینے میں بھی مصروف ہیں اور ایسے وقت ان کا یہ نعرہ مجذوب کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

فکر تونسوی

اجارہ داری

خدایا مرے!
اگر تو کبھی میری دھرتی پہ آئے!
دکھاؤں تجھے اپنے کھیتوں کے زرتار سینے اُبلتے ہوئے
دکھاؤں سمندر کی چادر پہ گوہر مچلتے ہوئے
دکھاؤں، کہ میں نے لہو سے لگا کر تمنا کی بازی
تراشے، بنائے، اُٹھائے ہیں کیسے سُنہرے محل
بھری سنگ و آہن کے جامد کلیجوں میں سانسوں کی رَو
اندھیری اندھیری خدائی کو بخشی نگاہوں کی ضَو
ہوا ذرہ ذرہ مرے جامِ اُلفت کے نشہ میں چور
بنی پتّی پتّی مرے واسطے زندگی کا غرور
بہاروں پہ میرا تسلّط، ستاروں پہ میری کمند
ہواؤں کو بھی روندتے پھر رہے ہیں مرے ارجمند
دکھاؤں، کہ تیرے جہاں کو بنایا ہے کتنا حسیں
خدایا! تری دی ہوئی زندگی پر میں نادم نہیں
خدایا مرے!
اگر تو کبھی میری دھرتی پہ آئے!
دکھاؤں تجھے پھر وہ سنگیں حصار
ہے جس میں یہ سب زِلیست کا حُسن بند
وہی زیست، جس پر میں نادم نہیں
اُسی پر نہیں ہے مرا اختیار
کہ سنگین تانے ہمیشہ وہاں
کھڑے رہتے ہیں چند ناکردہ کار

نریش کمار شاد

ذرّے

انہیں ذرّوں نے سنوارا رخِ گیتی کا جمال
انہیں ذرّوں نے تواریخ کے پھیکے عارض
انہیں ذرّوں نے جلائے ہیں تمدن کے دیے
اپنے چہروں کی تب و تاب سے گلریز کیے

انہیں ذرّوں کے درخشندہ لہو کی سُرخی
کبھی چمکاتی رہی مذہب و رنگت کے ضمیر
ہر نئے چاند کی روداد کا عنوان بنی
اور کبھی تخت کی تزئین کا سامان بنی

انہیں ذرّوں نے سیہ رات کی خونریزی میں
پھولتے پھلتے رہے شاہ و پیمبر کے چمن
جنگ کے قحط کے افلاس کے آلام سہے
اور یہ بیچارے خزاں رنگ و زبوں حال رہے

ان کی پلکوں پہ جھلکتے رہے اشکوں کے نجوم
ان گنت سال گزرتے رہے جھونکوں کی طرح
خاک و افلاک پہ چھایا رہا ظلمت کا غبار
ان کی مرجھائی ہوئی زیست پہ آئی نہ بہار

اور اب جبکہ نئی صبح کی زرّیں ضو سے
ان کے سینوں میں بغاوت کے ترانے گونجے
تیرگی ختم ہوئی نیند کا جادو ٹوٹا
ان کی شریانوں میں احساس کا لاوا پھوٹا

اور یہ ذرّے دہکتے ہوئے شعلوں کی طرح
کانپ کر رہ گئے مذہب کے فسردہ ڈھانچے
اپنے احساس کی حدت سے کچھ ایسے بھڑکے
قصرِ شاہی کے فلک بوس منارے دھڑکے

کون اس بڑھتے ہوئے سیل کو روکے بڑھ کر
اب تو جل جائے گا جو راہ میں حائل ہوگا
کس میں جرأت ہے کہ یہ ناچتے کوندے پکڑے
اب کوئی چال کوئی جال انہیں کیا جکڑے

اب تو یہ ذرے کہ و دشت میں بحر و بر میں
بڑھتے ہی جائیں گے طوفان کے دھاروں کی طرح
اک نئے عزم نئے شوق نئے جوش کے ساتھ
وسعتِ ارض پہ چھائیں گے بہاروں کی طرح

اب نہ لہرائے گی ظلمت رُخِ دوراں پہ کبھی
اب نہ انسانوں پہ انسان ستم راں ہوں گے
رات کے ساتھ گئی چاند ستاروں کی دمک
اب یہی ذرے ہراک سمت فروزاں ہوں گے

سردار الھام

ڈوبتے تارے

جگمگاتے ہیں ابھی تک نقشِ پائے رہرواں
ہاں انہیں راہوں سے گزرا ہے ہمارا کارواں
ہم نگہدارِ اخوت، حریت کے پاسباں
موت کی محفل میں چھیڑی زندگی کی داستاں

مردنی سی چھاگئی تھی جب کہ احساسات پر
جب اُداسی حکمراں تھی قلبِ موجودات پر
فکر پابستہ تھی پابندی جواں جذبات پر
جھوم جاتی تھی جوانی آتشیں نغمات پر

ہم تلاطم خیز موجوں سے اُلجھتے ہی رہے
گاہ اپنوں کے کبھی اغیار کے طعنے سہے
گونج اُٹھتے تھے فضا میں زہر آگیں قہقہے
کتنے پوشیدہ حقائق، راز کتنے اَن کہے

ذوقِ گویائی سے دنیا نے طاقت چھین لی
رعبِ استبداد نے فہم و فراست چھین لی

اشعر ملیح آبادی

گردش

یہ گزرگاہ بھی ویران ہوئی جاتی ہے
شام اب آتی ہے۔ اب آتی ہے
سرمئی رنگ کے آنچل ہیں فضا میں لرزاں
کہر سے ساری فضا دھندھ ہوئی جاتی ہے
شام ہی آج شبِ ہجر بنی جاتی ہے۔

سگرٹیں ختم ہوئیں
خاکداں سر پہ ہے کچھ خاک لئے سینے پر
پھر بھی سگرٹ کے دھوئیں سے مرے کمرے میں مہک باقی ہے
اور یہ سرمئی مرغولے —— دھوئیں کے بادل
میری کھڑکی کے ہر اک شیشے سے ٹکراتے ہیں، ٹکرا کے پلٹ آتے ہیں
دیر تک پھر مرے کمرے کی فضاؤں میں یہ چکراتے ہیں

شام کے سائے میں دن ڈوب رہا ہے لیکن —— نہ صدا ہے نہ خروش
بسترِ مرگ پہ جس طرح کوئی ایسا مریض
جو کہ بس ایک ہی لمحے کے لئے زندہ ہو
نہ کوئی چیخ، نہ آہ —— نہ پکار اور نہ کراہ
اور بیچارہ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے
آخری بار ہر اک چیز کو حسرت سے تکے جاتا ہو۔

آفتاب اپنی تمازت کو کہیں کھو بیٹھا
اور اب ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں
جال پھیلاتی ہیں۔ پیڑوں کی پھنگوں پہ، محلات کی کھڑکی کے رنگے شیشوں پر
ڈوبتی کرنیں بڑھا دیتی ہیں ہر چیز کا حسن
اور خود ڈوب کے انجان اندھیروں میں بھٹک جاتی ہیں۔

شام بس ایک ہی لمحے سے تو پائندہ ہے
یہی اک لمحہ بدل دیتا ہے کونین کے چلتے ہوئے کام
پھر بھی یہ لمحہ کوئی چیز نہیں ——
گردشِ ارض کا پابندہ ہے ہر اک لمحہ۔

الطاف مشہدی

دعا

سنہرے گال خراشوں کا درد سہتے ہیں
گھنیری پلکوں میں اشکوں کے رقص بہتے ہیں

کھنک کے شور میں عصمت کی سانس ٹوٹتی ہے
گہن کے نام سے کرنوں کی نبض چھوٹتی ہے

بہاریں سُود کی خوراک بنتی رہتی ہیں
فضائیں ظلم کے طوفان جنتی رہتی ہیں

اُجالے ظلمتوں کی آندھیاں اُگلتے ہیں
ستارے تیرگی کی وادیوں میں پلتے ہیں

نشیلے لب ہیں تبسم کی ضَو سے بیگانہ
نگاہِ ناز میں رقصاں غموں کا افسانہ

بُڑھاپا اُٹھتی جوانی کا خون پیتا ہے
ہوس کا ناگ اِسی کے سہارے جیتا ہے

کھنکتی پیٹیوں کی سُرخ سُرخ اولادیں
بنی ہوئی ہیں کسانوں کے لب پہ فریادیں

تجوریوں کی وباؤں نے کھیت چاٹ لئے
ٹھنک ٹھنک کی صداؤں نے کھیت چاٹ لئے

بہار زردیوں کی چادروں میں لپٹی ہے
چمن کی سبز قبا تھیلیوں میں لپٹی ہے

مگر لبوں پہ دعائیں تھرک رہی ہیں ابھی
یہ مست ناگنیں پیہم سرک رہی ہیں ابھی

دعا اگرچہ حقیقت میں ایک دھوکا ہے
مگر دعاؤں کو اب تک کسی نے روکا ہے

سام پرکاش اشک

دھرتی لہولہان

چاروں کونے موت کی برکھا، چاروں کونے آگ
آزادی کے ساز سے پھوٹے کیسے خونیں راگ
ڈگر ڈگر لاشوں کی بو ہے، نگر نگر شمشان
دھرتی لہو لہان ہے ساتھی، دھرتی لہو لہان!

مانوتا کو کون بچائے، کون یہ جلتی آگ بجھائے
کون کسی کا دامن پکڑے، کون کسی کو راہ سُجھائے
وہ پیغمبر کی اُمّت، یہ رشیوں کی سنتان
دھرتی لہو لہان ہے ساتھی، دھرتی لہو لہان!

دین دھرم کی اس دھرتی پر بٹ گئے آج انسان
ختم ہوئے برسوں کے ناطے، صدیوں کی پہچان
آج سبھی ہندو مسلم ہیں، کوئی نہیں انسان
دھرتی لہو لہان ہے ساتھی، دھرتی لہو لہان!

نیتاؤں نے سب کچھ بانٹا، لیکر دین دھرم کا کانٹا
مِلّیں اور جاگیریں بانٹیں، جنتا کا دُکھ درد نہ بانٹا
اپنی ضد کی بھینٹ چڑھا دی نردوشوں کی جان
دھرتی لہو لہان ہے ساتھی، دھرتی لہو لہان!

آج بھی راہوں پر لٹتی ہے، کیا محنت کیا لاج
چیخ رہی ہے گھائل دھرتی! ہے مہراج ادھیراج
کِس کا پاکستان بنا ہے، کس کا ہندوستان
دھرتی لہو لہان ہے ساتھی، دھرتی لہو لہان!

اختر ہوشیار پوری

سہارا

بارہا تو نے بھی نظارہ یہ دیکھا ہوگا
جب گھنی زلفیں گھٹاؤں کی بکھر جاتی ہیں
ڈوب جاتا ہے کسی گہرے تفکر میں جہاں
آرزوئیں غمِ فردا کا پہن کر جامہ
زیست کو اور بھی تاریک بنا دیتی ہیں
یہ گھنی زلفیں ابھی کھل کے بکھرتی بھی نہیں
جانے کس سمت سے طوفان اُمنڈ آتے ہیں
جن کی لہروں پہ بہی آتی ہیں کومل کلیاں
رس بھرے پھول بھی پتے بھی جواں غنچے بھی
وقت نے جن کو زمانے میں پنپنے نہ دیا
یہ بپھرتے ہوئے طوفاں یہ لپکتی موجیں
ان حسیں پھولوں کو پتوں کو جواں غنچوں کو
یوں پٹختی چلی جاتی ہیں بڑھی جاتی ہیں
جیسے دنیا میں یہی تو ہیں خدا کوئی نہیں
اور ایسا بھی ہوا ہے کہ ہوا کے جھونکے
ان گل و برگ کو ساحل سے لگا دیتے ہیں
جہاں ملتا ہے اُمنگوں کو سکونِ ابدی
زندگی کی شبِ تاریک ضیا پاتی ہے
میری مجبور تمنائیں اُمیدیں بھی یونہی
وقت کے تُند تھپیڑوں میں بہی جاتی ہیں
اور یہ چاہتی ہیں ان کو بھی ساحل مل جائے
اور تو جانتی ہوگی کہ وہ ساحل تو ہے

دانش ممتاز

تاریک اُجالا

زندگی آج بھی بھٹکتی ہے
تیرہ و تار اداس راہوں میں
حسرتوں کے دیے جھلکتے ہیں
جس کی ویران سی نگاہوں میں

چُور ناکامیوں کے بوجھ سے چُور
اور مصروفِ جستجوئے سحر

وہ سحر جس کی نرم کرنوں پر
کامرانی کا راگ رقصاں ہے
جگمگاہٹ ہے شوخ لمحوں کی
صبحِ نو کا سہاگ رقصاں ہے

لیکن اے دوست یہ جہانِ خروش
صبحِ کاذب کے گیت گاتا ہے

حالانکہ آرزو کے خاکوں میں
رنگِ آلام اب بھی گہرا ہے
اب بھی قائم ہے تلخیٔ دوراں
اب بھی فکر و عمل پہ پہرا ہے

زندگی اب بھی ہے سراسیمہ
تیرہ و تار اداس راہوں میں

احمد فاروقی

فانی کی شاعری کا ایک روشن پہلو

محب مکرم ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی جنہوں نے فانی کو بہت قریب سے دیکھا تھا ایک صحبت میں فرماتے تھے۔ "فانی کی ابتدائی زندگی بڑی امیرانہ شان سے گزری تھی۔ زہرہ صبح بھی تھا اور جامِ بلور بھی۔ گھر کا سارا اندوختہ ختم کر دیا تھا، لیکن خودداری کا یہ عالم تھا کہ اپنے بے تکلف دوستوں سے بھی اپنی پریشان حالی کا ذکر نہ کرتے تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد ان سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے، اور طرح طرح کے بہانوں سے ان کو حیدر آباد بلاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص کے ہاتھ سفر خرچ بھیجا، اور کہلوایا کہ میری زندگی اب زیادہ نہیں رہی ہے دنیا سے صرف ایک حسرت لئے جارہا ہوں کہ فانی کی صحبتوں سے محروم رہا۔ پایانِ عمر میں اگر یہ خواہش پوری ہوجاتی تو موت اتنی گراں بار نہ ہوتی، میں، لطیف اور غالباً مخمور، فانی کے پاس موجود تھے، انہیں دھکے دے دے کر حیدر آباد سوار کروایا، مہاراجہ نے بڑی دلداری کی۔ ایک خوبصورت اور سجا سجایا مکان رہنے کے لئے دیا اور ایک موٹر یہ کہہ کر دی کہ یہیں تو کہیں آنے جانے کے قابل رہا نہیں۔ میرے مکان سے آپکی قیامگاہ کا کافی فاصلہ ہے۔ جب مزاج چاہے اس میں تشریف لائیے گا۔ فانی نے کچھ دنوں کے بعد وطن جانیکی اجازت چاہی۔ مہاراجہ نے فرمایا۔ "مجھے اس حال میں چھوڑ کر کہاں جائیے گا" پھر یہ خیال کرکے کہ فانی کو یہ ملال نہ ہو کہ کچھ کام وام تو ہے نہیں، خواہ مخواہ روٹیوں پر پڑا ہوں۔ ان کو ایک شہزادے کا اتالیق مقرر کروادیا۔ وہ ایک دن آئے اور کہنے لگے:۔

"قبلہ آپ کی عنایتوں نے مجھے گستاخ بنادیا ہے۔ میرے مزاج کی وارستگی آپ کو معلوم ہے، وہاں کی پابندی اور القاب و آداب میرے بس کے نہیں ہیں" اس کے بعد وہ کسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہوگئے۔ لیکن لڑکوں کا شوروغل بھی ان کے بس کا نہیں تھا۔ مہاراجہ کے انتقال کے بعد کوئی اتنی بات بھی ان سے پوچھنے والا نہیں رہا اور آخری زمانہ انہوں نے سخت تکلیف، پریشانی اور ناخوشی کے عالم میں گزارا۔

حیدر آباد جس کی داد و دہش فیضِ سحر کی طرح عام ہے، اُس کی قدر شناسی کی تاریخ میں یہ عجیب و غریب واقعہ ہے کہ فانی نے اپنا تمام وقت آغوشِ غم اور پہلوئے حرماں ہی میں گزارا اور ان کی آرزوئیں بقدرِ خواہشِ دل پوری نہ ہوسکیں۔ ذیل کے اشعار انکی حیدر آباد کی زندگی کا مرقع ہیں:۔

دل کے سوا یہاں کوئی محرمِ دردِ دل نہیں — بے خبروں سے کیوں کہیں، اہلِ خبر سے کیا کہیں
حُسن جفا پسند سے، حسرتِ عرضِ شوق کیا — تشنہ لبی کا ماجرا، آپ کے گھر سے کیا کہیں

وعدوں پہ ہیں، کیوں ناحق اُمید کی تاکیدیں — بندھتی ہیں کہیں ظالم ٹوٹی ہوئی اُمیدیں
یہ فیضِ محبت ہے، اقبالِ محبت ہے — ہر آہ کو حاصل ہیں، تاثیر کی تائیدیں
آغازِ محبت کے اللہ وہ کیا دن تھے — وہ شوق کے ہنگامے وہ شوق کی تمہیدیں

فانی کے اس نامۂ منظوم سے جو انہوں نے مہاراجہ کشن پرشاد کے نام لکھا تھا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخر زمانہ میں انہوں نے بھی تغافل اور بیگانگی سی اختیار کر لی تھی، اور نانڈیڑ کے تبادلہ کو فانی عتاب سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ غرض اس میں شک نہیں کہ انکی زندگی بڑی نامرادانہ گزری۔ "او ایں چنیں بزیست کہ گویا خدا نداشت"

فانی کی ابتدائی زندگی بڑی رنگین اور مسرفانہ تھی۔ ان کے عشق کی ناکامی بھی تقریباً مسلم ہے۔ اور ان کے آخری دور کی پریشانیاں بھی مانی ہوئی حقیقت، غمِ عشق اور غمِ روزگار نے مل کر ان کے دل کو آتشکدہ بنا دیا تھا۔ اسی آگ کے شعلے زبانِ شعر سے نکلے ہیں۔ ان کی شاعری کا عنصرِ غالب، غم و اندوہ ہے لیکن یہ غم روایت نہیں، صداقت ہے۔ انہوں نے اسی آگ میں تپ کر اس کو گلزار بنایا ہے اور موت کو زندگی سے بھی زیادہ خوشنما لباس پہنایا ہے۔ یہ دلکشی — یہ زیبائی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب غم کا مفہوم وسیع ہو جائے، جب شاعر یہ کہہ سکے :-

ع دنیا سمٹ آئی ہے مرے دیدۂ تر میں (فانی)

یا ؎ یوں تو کچھ غم سے سروکار نہ راحت کی تلاش　　غم کوئی دل کے عوض دے تو خریدار ہیں ہم (فانی)

جب مسرت و الم کے سطحی امتیازات اٹھ جائیں جب غمِ جاناں اور غمِ دوراں میں فرق نہ رہے بقول عرفی ؎

در دلِ ما، غمِ دنیا، غمِ معشوق شود　　بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

فانی کے یہاں احساس، اپنی پوری درخشانی کے ساتھ موجود ہے لیکن اس کو اتنی مرتبہ یاسیات کا امام، بیوۂ عالم اور سوزخواں کہا گیا ہے کہ انکی شاعری کے بہت سے تابناک حصے اس تنقید کی ظلمت میں چھپ کر رہ گئے ہیں، لیکن اگر تنقیدوں کے بجائے خود اس کی پوری زندگی اور شاعری کو سامنے رکھا جائے تو یقین ہے کہ اس کی نوا اس درجہ مُردہ و افسردہ اور اس کا کلام اتنا بے کیف اور بے جان نظر نہیں آئیگا جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔

فانی کی شاعری نے اس وقت آنکھ کھولی جب لکھنؤ اور دہلی اسکول کی حدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ لکھنؤ کی زبان، دہلی کے حُسنِ معنی سے ہم کنار ہو چکی تھی۔ تخلیقِ معانی، صنعت گری سے زیادہ اہم سمجھی جاتی تھی۔ غزل اور مرثیہ کی شاندار روایات موجود تھیں لیکن اس پیکر میں کوئی نئی روح پھونکنے والا موجود نہیں تھا۔ کچھ روایتی غزل گو شعراء نے الفاظ سے اشعار کے گلدستے بنائے تھے، لیکن رنگ و نکہت کے سراب نے ان کو شادابی اور طراوت سے محروم رکھا تھا، فانی نے اپنے دل کی گلابی سے ان الفاظ و معانی کو نئے رنگ میں رنگ دیا۔ وہ زخمِ دل کے بھر جانے سے ڈرتا ہے۔ وہ بغیر مرگ زیست کے لئے آمادہ نہیں، اسے یہ غم ہے کہ جہم جاوداں نہیں ملتا۔ وہ بقید چاک گریباں، وحشت روا نہیں رکھتا۔ وہ در و دیوار کے ساتھ ویرانی ضروری سمجھتا ہے۔ جنوں سے بھی اسے آزادی کی توقع نہیں۔ وہ آہِ جگر گداز اور نالۂ دل خراش کو حاصلِ زندگی سمجھتا ہے۔ آرزوئے مرگ اُسے مرنے نہیں دیتی۔ بے خلشِ مدعا اُسے لطفِ حیات نہیں ملتا، اس کے نزدیک دردِ لا علاجِ محبت، ہی دوا ہے اور داغِ دل، نقشِ مدعا — یہ وہ منزل ہے جب درد "روحانی" بن جاتا ہے اور آرٹ اپنے بلند ترین مقام پر فائز ہوتا ہے۔

بعض نقادوں نے فانی کی گریہ و زاری، اور جذبۂ الم کی بے کیف یک رنگی و فراوانی پر اعتراض کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غم کا جذبہ اس کے کلام پر چھایا ہوا ہے لیکن وہ بے کس عورتوں کی طرح ٹھہک ٹھہک کر نہیں روتا۔ اس کی موت زندگی سے زیادہ دلکش ہے اور اس کا غم، تبسمِ گل سے زیادہ پائدار اور دل آویز۔

وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں — مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

زندگی سے ہو بیزار فانی اس سے کیا حاصل — موت کو منالوگے جان سے خفا ہو کر

مری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول — تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

اللہ رے نوکِ نشترِ غم کی لگاوٹیں — اِک اِک لہو کی بُوند پہ ظالم مچل گئی

اس میں شک نہیں کہ فانی نے وہی قفس و آشیاں، شمع و پروانہ، ہجر و وصال، بہار و خزاں، اور زنداں و صحرا کے مضامین پر خامہ فرسائی کی ہے لیکن اس زمانہ میں کم شاعر ہیں جنہوں نے ان مفروضات و علامات کو اتنی صحت و صداقت کے ساتھ استعمال کیا ہے، اور غالباً اس سے بھی کم شاعر ہیں جنہوں نے ان کی اتنی توجیہات پیش کی ہیں:-

کل تک یہی گلشن تھا، صیاد بھی، بجلی بھی — دنیا ہی بدل دی ہے تعمیرِ نشیمن نے

ہاں ناخنِ غم کمی نہ کرنا — ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے

بہار آئی کہ یارب عید آئی اہلِ زنداں کو — گریباں نے گلے لپٹا لیا ہے بڑھ کے داماں کو

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی — مُنہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

بجلیاں شاخِ نشیمن پہ بچھی جاتی ہیں — کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا

اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دن ہے منحصر — وعدۂ دید چاہیئے زحمتِ انتظار کیا

وحشت بقیدِ چاکِ گریباں روا نہیں — دیوانہ تھا جو معتقدِ اہلِ ہوش تھا

کیا جانئے کہ حشر ہو کیا صبحِ حشر کا — بیدار ترے دیکھنے والے ہوئے تو ہیں

طولِ رودادِ غم معاذ اللہ — عمر گزری ہے مختصر کرتے

فانی کی خون افشانی کی وجہ سے عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ وہ صرف رُلا سکتا ہے لیکن اگر اس کے کلام کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ دامن پر گُلکاریاں بھی کر سکتا ہے وہ حسن و افسردگی ہی کے تخلیقی فلسفہ میں یدِ طولیٰ نہیں رکھتا بلکہ اس کے کلام میں تغزل کی چاشنی، پُرکاری و نکتہ وری، کیف و سرمستی، رنگینی و معاملہ بندی کے بھی اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ افسوس ہے کہ فانی کے بہت سے پڑھنے والوں نے ان اشعار کو یکسر نظرانداز کر دیا ہے۔ ان میں وہ حُسن، تاثیر اور شعریت پورے طور پر موجود ہے جو فانی کے نزدیک شاعری کا سب سے بڑا معیار تھا۔[1]

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا — بات پہنچی تری جوانی تک

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جان سے دُور — جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

فرصتِ یک نظر کے بعد، حوصلۂ دعائے وصل — کیوں دلِ قدرناشناس اب یہ مجال ہو گئی

[1] رسالہ سب رس حیدرآباد دکن ریڈیو نمبر

ہم کہاں اور نگاہِ شوق کہاں / وہ بھی تیری نگاہ ہوتی ہے

دیکھئے یہ "جنازہ بردوش" شاعر اس لَے میں بھی گا سکتا ہے:-

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اُٹھے / وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے
ہر آن فتنہ ہے، ہر فتنہ اک قیامت ہے / ترا شباب ہوا، دورِ آسماں نہ ہوا

حیرت ہوتی ہے کہ یہ "حسرتی موت" حسن ایسا اداشناس اور اس درجہ شیوا زبان و کافر بیان بھی ہو سکتا ہے:-

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اُٹھا / مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اُٹھا
ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا / اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا
چشمِ ساقی کی وہ مخمور نگاہی توبہ / آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
ہے ترا حسن تغافل جسے جو چاہے فریب / ورنہ تو اور جفاؤں پہ پشیماں ہونا
تجھے خبر ہے ترے تیرِ بے پناہ کی قسم / بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا
طبعِ نازک پہ بار اک اک حرف / حالِ دل، حرفِ داستاں انجام
کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن میں ہے / کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

یہ نور آگیں اشعار بھی فانی ہی کے ہیں جس کو "سوز خواں" اور "مرگ پرست" کہا گیا ہے:-

اک برق سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی / دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی
محضر ہے یہی قتلِ شہیدانِ وفا کا / جلاد کی چتون ہے جو شرمائی ہوئی سی
درپیش ہے پھر مسئلہ طاقتِ دیدار / پھر کچھ نگہِ شوق ہے گھبرائی ہوئی سی

جس دل پہ کی نظر وہی پہلو میں پھر نہ تھا / شوخی تو دیکھئے نگہِ انتخاب کی
تمہارے عشق کا اللہ رے فیض / جگر میں دھوم ہے دردِ جگر کی
نہ بن پڑا کوئی عذرِ جفا کسی سے تو ہائے / ادا وہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی
زباں کٹتی ہے ذکرِ آشیاں پر / تمنا بھی بہت تھی آشیاں کی
حسن بیتابِ خودنمائی تھا / دل ہمیں روبرو کئے ہی بنی
چاک دامن کے مشغلے کے لئے / چاکِ دامن رفو کئے ہی بنی
کھو گئے ہم کچھ اس طرح فانی / کہ اُنہیں جستجو کئے ہی بنی
مانا حجابِ دید، مری بیخودی ہوئی / تم وجہ بے خودی نہیں یہ ایک ہی ہوئی

کیجئے دعا کہ اُف تو کرے دردمندِ عشق — اوّل تو دل کی چوٹ پھر اتنی دُکھی ہوئی
یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں — آواز آ رہی ہے یہ کب کی سُنی ہوئی

ان اشعار کی نازک خیالی سہل ممتنع کے درجہ پر پہنچ گئی ہے:-

ترکِ تدبیر کو بھی دیکھ لیا — یہ بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی
اللہ اللہ یہ حسنِ پرسشِ حال — کہ مرے حال پر نظر نہ ہوئی
آج تسکینِ دردِ دل فانی — وہ بھی چاہا کئے مگر نہ ہوئی
کچھ نظر کہہ گئی، زباں نہ کھلی — بات اُن سے ہوئی مگر نہ ہوئی
حشر کا دن بھی ڈھل گیا فانی — دل کی روداد مختصر نہ ہوئی

یا کہتے تھے، کچھ کہتے جب اس نے کہا کہیے — تو چُپ ہیں کہ کیا کہیے کھلتی ہے زباں کوئی
ضبط کا حوصلہ نکل جاتا — کچھ ستم اور بھی کئے ہوتے

مشتاق خبردار رہیں دل سے جگر سے — ملتی ہے زمانے کی نظر ان کی نظر سے
من جائیں اگر تم ہمیں جھوٹوں بھی منالو — وعدے سے، تسلّی سے، دلاسے سے، قسم سے

اس غزل کا ہر شعر انتخاب ہے اور اس کے بیشتر اشعار رنج سے زیادہ مسرت کی کیفیت پیدا کرتے ہیں:-

قطرہ دریائے آشنائی ہے — کیا تری شانِ کبریائی ہے
تری مرضی جو دیکھ پائی ہے — خلشِ درد کی بن آئی ہے
وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا — نارسائی سی نارسائی ہے
کون دل ہے جو دردمند نہیں — کیا ترے درد کی خدائی ہے
جلوۂ یار کا بھکاری ہوں — شش جہت کاسۂ گدائی ہے
موت آتی ہے تم نہ آؤگے — تم نہ آئے تو موت آئی ہے
بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے — کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے
ترکِ اُمید بس کی بات نہیں — ورنہ اُمید کب بر آئی ہے
مژدۂ جنّتِ وصال ہے موت — زندگی محشرِ خدائی ہے
آرزو پھر ہے درپے تدبیر — سعیٔ ناکام کی رہائی ہے
موت ہی ساتھ دے تو دے فانی — عمر کو عذرِ بے وفائی ہے

اس غزل میں کیسی موسیقیت اور خوش آہنگی ہے اور اس خاموشی میں کتنی گویائی پوشیدہ ہے۔

آٹھ پہر کی یہ بے چینی، یہ بیتابی کیا کہیے — حد سے گزری دل کی خرابی، دل کی خرابی کیا کہیے
تم کیا جانو کیا شے ہے طوفان سرشکِ خونیں کا — تم نے چھلکتے ہی نہیں دیکھی دل کی گلابی کیا کہیے
ہائے وہ پہلی نظروں میں ہر موج کا ساحل بن جانا — بحرِ بے پایانِ محبت کی پایابی کیا کہیے
اگلے برس کے پھولوں کا کیا حشر انہیں معلوم نہیں — کلیوں کا یہ طرزِ تبسم یہ شادابی کیا کہیے
کتنے فتنے جمع کیے ہیں ان کی ایک جوانی نے — چال قیامت، کافر نظریں، آنکھ شرابی کیا کہیے
خاکِ وطن ہی راس نہ آئی غربت تو پھر غربت ہے — فانی اپنی خانہ بدوشی، خانہ خرابی کیا کہیے

"خالص شاعری" Pure Poetry میں ابداعِ سخن اور تزئین بیان کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے ہو گا:۔

کاش میری زبان سے سنتے — اب جو سنتے ہو بے زبانی سے
حشر کو بھی ہے دور کی نسبت — چشم بد دور اس جوانی سے
کچھ خبر بھی ہے روٹھنے والے — زندگی روٹھتی ہے فانی سے

فانی اب ان کی یاد پر کیا کیجئے نثار — مدت ہوئی وداعِ دل و جاں کیے ہوئے

اب انہیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے — چشم بد دور دلہن بن کے شباب آتا ہے
دل کھوئے ہوئے برسوں گزرے ہیں مگر اب بھی — آنسو نکل آتے ہیں جب دل نظر آتا ہے
دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے — تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

فانی کے کلام میں فکر و جذبہ اور حس و ادراک کا خوشنما امتزاج ہے۔ اس نے میر و غالب کی خصوصیات کو اپنے یہاں سمو لیا ہے، فانی نے اس جہانِ معنی کے تیار کرنے میں مومن و غالب کی سی ترکیبوں سے بھی مدد لی ہے۔ مثلاً آزردہ مشق رفو، شعلۂ آرمیدہ، عیشِ غم انجام، شکایت گلہ بے اثر، آرزوئے صبر شکن، غم کدۂ اعتبار، حرفِ داستان انجام، اعتماد نوازش، حیاتِ مرگ نواز زبان اور بیان کی لطافت اور متانت نے ان کے کلام کا اثر بڑھا دیا ہے۔

فانی کے کلام میں طرفگیٔ مضامین اور تنوع خیالات زیادہ نہیں ہے، اُس نے اپنی دنیا غم سے بنائی ہے، لیکن اس کا غم قطرۂ وسعت طلب ہے جس سے کیفیات و جذبات کے طوفان برپا ہو سکتے ہیں۔ اس کی درد آشنائی اہم ہے اور بہت اہم ہے لیکن اس کی رنگینی اور مسرت زائی بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ یہ نوحہ و نغمہ کی کیفیات بلیک Blake کی طرح اس کی اپنی ہیں۔ نہ وہی دیکھتا ہے جو وہ دیکھتا ہے اور وہ وہی محسوس کرتا ہے جو وہ کرتا ہے۔ یہ صداقت اور خلوص شاعری کی دنیا میں ایسی نعمت اور سعادت ہے جو زورِ بازو سے حاصل نہیں ہوتی۔ فانی خالص شاعری کا علمبردار ہے۔ اس کے کلام میں غیر شعر کی آمیزش نہیں ہے۔ اسی وجہ سے بعض وقت زرِ خالص کی طرح ان اشعار کے آبگینوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، پھر بھی اس کا یہ کمال کیا کم ہے کہ اُس نے رضا کو تسلیم کی نظر سے دیکھا ہے اور اس طرح بارِ حیات کو ہلکا کر دیا ہے۔ اس نے تیرگیٔ شام کو نورِ سحر قرار دیا ہے، اور اس طرح ہمیں ظلمت کے برداشت کرنے کا اہل بنا دیا ہے۔

دیویندر اسر

بوڑھا برگد

(ایک تنقیدی جائزہ)

ماہنامہ "چندن" کانپور کے اکتوبر ۱۹۴۶ء کے شمارے میں سرمایہ و محنت کی کشمکش کے موضوع پر پرتھوی ناتھ شرما کا ایک افسانہ بعنوان بوڑھا برگد شائع ہوا ہے۔ آج بین الاقوامی مزدور تحریک کی رہنمائی میں محکوم قوموں کی جنگ آزادی اور دنیا کے محنت کش عوام کی جدوجہد اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ ہر جمہوریت پرست اور آزادی پسند فن کار اور ادیب کے لئے یہ لازم ہو گیا ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل کو مزدور طبقے کے اجتماعی شعور کے ساتھ ہم آہنگ کر دے، ترقی پسند ادیبوں کا یہی طرہ امتیاز رہا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ مزدور دشمن اداروں اور نظریوں کی مخالفت کی ہے اور نئی تہذیبی اور سماجی قدروں کی تبلیغ کی ہے۔ دنیا بڑی سرعت سے دو مخالف صفوں میں تقسیم ہو رہی ہے۔ ادب۔ فن۔ علوم۔ اور دیگر سماجی اور ثقافتی ادارے انہیں دو صفوں میں سے کسی ایک صف کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس نظریہ پر ترقی پسند ادبا کی دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ ان کا ادب آزادی پسند عوام کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرے گا یا سرمایہ پرست سیاست دانوں کے گمراہ کن نظریات کے سامنے سر تسلیم خم کر دے گا۔ ترقی پسند ادب ہمیشہ عوامی جدوجہد کے دوش بدوش نشو و نما پاتا رہا ہے۔ موجودہ بحرانی حالات میں کوئی بھی ادیب جو ان دو مخالف صفوں میں باہمی اشتراک کی امید رکھتا ہے یا کسی تیسری قوت کے بارے میں سوچتا ہے تو وہ رجعت پسند نظریات کا شکار ہو گیا ہے۔ ایسے ادیب اگر غیر شعوری طور پر اس رجعت پرست فلسفہ کے مؤید ہو گئے ہیں تو انہیں پوری کوشش سے ان رجحانات کی بیخ کنی کرنی چاہیئے۔ اور جو ادیب دیدہ و دانستہ اپنے ادب کے ذریعے اس نظریے کی ترویج کر رہے ہیں وہ عوام دشمن گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ پرتھوی ناتھ اس افسانے میں غیر شعوری طور پر اس سرمایہ پرست نظریے کی ترجمانی کر رہے ہیں تاہم موجودہ سماجی پس منظر میں اس افسانے کا تجزیہ کرنا اور رجعت پسند خیالات کو بے نقاب کرنا اشد ضروری ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ کس طرح ترقی پسند ادیب بھی بورژوا غلط فہمیوں کا شکار ہو کر عوام دشمن نظریات کی اشاعت کر سکتا ہے۔

پیشتر اس کے کہ افسانے کا تنقیدی جائزہ لیا جائے اس کے پلاٹ کا بیان کر دینا موزوں رہیگا۔ ایک بوڑھا برگد ہے جس کے چاروں طرف متوسط اور خوشحال طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ ان لوگوں میں مالک رتن کمار بھی تھے جن کی لڑکی سیتا بوڑھے برگد کی طرف فلسفیانہ انداز سے دیکھتی رہتی تھی اس کو یہ عظیم درخت قدامت کا نشان معلوم ہوتا تھا۔ اس نے عزم باندھ رکھا تھا کہ وہ اس نشان کو ایک نہ ایک روز چکنا چور کر ڈالیگی۔ نیکی اور بدی کے سبق پڑھتی سیتا آگے کی طرف بڑھی حتیٰ کہ اُسے چیزوں میں امتیاز کرنے کی حس پیدا ہو گئی۔ گدے دار کرسی پر بیٹھے بیٹھے اور سنہری جلد والی کتابیں پڑھ کر اسے یقین ہونے لگا کہ دنیا کے دُکھوں کو دور کرنے کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ چیزوں کو برابر برابر بانٹ دینا اور مل مزدوروں کو سونپ دینا۔ اس خیال کو دماغ میں لیکر اُس نے ایک روز اپنے باپ سے بات چیت کی۔ لیکن باپ کے جوابات سے اُس کی تسکین نہ ہوئی، بلکہ اُسے غصہ آنے لگا۔ اُسے ہر ایک

اُس چیز سے جس سے امارت کی بُو ٹپکتی ہو نفرت ہو گئی۔ بوڑھے برگد کی شاخوں کو دیکھ کر سنیتا کو بڑی خوشی ہوتی کہ مل مالک ملوں کو مزدوروں کے سپرد کر دیں گے اور زمیندار کاشتکاروں میں زمین برابر برابر بانٹ دیں گے۔ ایک بار رتن کمار کی مل کے مزدور اپنے حقوق منوانے کے لئے جمع ہو گئے۔ جلسے میں نعروں کی آواز سُن کر سنیتا بھی اس جگہ پہنچ گئی جہاں مزدور راہ نما تقریر کر رہا تھا۔ مزدور راہ نما بڑے جذباتی انداز میں مزدوروں کی تکالیف بیان کر رہا تھا اور مزدور نعرے لگا رہے تھے مل کو آگ لگا دو۔ سنیتا نے صدر صاحب کی اجازت سے سبھا میں تقریر کی اور بتایا کہ اُسے مزدوروں کی تکالیف کا شدید احساس ہے اور وہ اپنے پتا جی سے مزدوران کی بات منوا کر رہیگی۔ اسکی تقریر سے مزدور اتنے متاثر ہوئے کہ سبھا میں نعرے گونج اٹھے۔ سنیتا دیوی کی جے، سنیتا دیوی کی جے۔ رتن کمار نے اِس سلسلے میں سنیتا سے باز پرس کی اور اُسے سمجھایا کہ مل نقصان سے چل رہی ہے۔ اتفاق سے میں مل مالک ہوں اور وہ میرے مزدور۔ دونوں ایک ہی کام میں لگے ہوئے ہیں، کمائی۔ ایک دن ایسا ہو سکتا ہے کہ میں مزدور بن جاؤں اور کوئی مزدور مل مالک۔ لیکن سنیتا نے غصے سے کہا کہ آپ پُرانے خیالات سے مجھے بہلانا چاہتے ہیں۔ اس جنون کی سزا میں اُس کے والد نے اُسے ہڑتال کے فیصلہ نہ ہو جانے تک کے لئے گھر میں نظر بند کر دیا۔ رتن کمار نے مزدوروں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ہڑتالی لیڈر بضد تھے کہ تنخواہ میں کٹوتی کو بحال کیا جائے۔ مل مالک کی باتیں سُنکر سب سے بڑا ہڑتالی لیڈر ہر بار کہتا، آپ ہم کو بہکا رہے ہیں یہ سب سرمایہ دارانہ چالیں ہیں۔ آپ لوگوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ انقلاب۔ رتن کمار نے سمجھایا کہ اس صورت میں مزدوری سب کو کرنی پڑتی ہے، لیکن مزدور خیالات کے غلام تھے۔ ایک طاقتور خیال نے اُنکو اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ وہ شاید یہ بات نہیں سمجھتے تھے کہ قحط کی صورت میں ہر انسان پر اثر پڑتا ہے۔ اگر اناج کا ایک دانہ بھی نہ رہے تو کون بانٹے اور کون کھائے۔ کوئی سمجھوتہ نہ ہونے کی صورت میں مل بند کرنی پڑی جس کا رتن کمار کو بہت افسوس تھا۔ سنیتا نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ مل بند کرنے کے بجائے مزدوروں کو ہی سونپ دیتے۔ رتن کمار نے سمجھایا کہ بجائے اس قسم کی احمقانہ حرکات کرنے کے ہمیں قدرت کو زیر کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ سنیتا ایسی کُن جواب پاکر اپنے کمرے میں آکر زور زور سے رونے لگی۔ سنیتا نے اس رات خواب میں دیکھا کہ مزدوروں نے اس کے باپ کو بڑی بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ اور وہ بھیانک خواب سے ڈر کر جاگ پڑی۔ اُسے معلوم ہوا کہ مل کو مزدوروں نے آگ لگا دی ہے اور رات کو بوڑھے برگد کا درخت بھی جڑ سے اُکھڑ گیا ہے آخر میں مُصنف نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بوڑھے برگد کے جڑ سے اُکھڑ جانے اور مل میں آگ لگ جانے کے دو عملوں میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور تھا۔

اِس پلاٹ کو مصنف کے اپنے الفاظ ہی میں بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ افسانہ کیوں مزدور تحریک کا ہمنوا نہ ہو کر بورژوا نظریات کی اشاعت کا آلۂ کار بن گیا ہے۔

سب سے پہلے ہمیں اس بات کو واضح کرنا ہے کہ مصنف نے اپنے آپ کو کس کردار سے مماثلت دی ہے۔ افسانہ کی ہیروئن سنیتا ہے۔ سنیتا کے خیالات اور مصنف کے نظریات میں یگانگت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل چند فقرے ملاحظ فرمائیں۔ مصنف رقمطراز ہے:۔

"موسم خزاں آیا۔ برگد کے پتے پیلے پڑ پڑ کر مرجھا گئے ہیں اور ٹہنی چھوڑ کر زمین کے فرش پر بکھر گئے ہیں۔ چلتے جاڑے کی سرسر ہوا میں بوڑھے برگد کی ننگی ٹہنیاں ہلتیں اور ایسا معلوم پڑتا کہ کوئی غریب برہنہ دوشیزہ سردی سے کانپ رہی ہے۔ سرمایہ دار نے اُس کے تن کا کپڑا تک اُتار لیا ہے اور بدن پر کوڑے کی مار ماری جا رہی ہے، جس کی وجہ سے وہ لرزاں ہے؟"

سنیتا کو ننگی ننگی ٹہنیوں کو دیکھ کر مسرت سی حاصل ہوتی جیسے قدامت اس کے سامنے برہنہ اور شرمسار ہے۔ ننگے پن اور بے عزتی کے باوجود ڈھیٹ کی طرح اڑی کھڑی ہے۔ سنیتا کو یقین ہو تا گیا کہ قدامت ایک نہ ایک روز نئے خیالات کو جگہ دیگی۔ ایک ایسے پودے کو جس میں سرخ سرخ کونپلیں اُگیں گی اور انسان کا دل اُن کونپلوں کے رنگ کو دیکھ کر خوشی سے جگمگا اُٹھے گا۔"

مندرجہ بالا دونوں تشبیہوں کا فرق مصنف اور سنیتا کے اختلاف الرائے کو عیاں کرتا ہے۔ مصنف بوڑھے برگد کی طرف ہمدردی اور رحم سے دیکھ رہا ہے، جبکہ سنیتا اُسے قدامت کا نشان سمجھ کر جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دینے کی متمنی ہے۔ اِسی طرح کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ہم کچھ دیر کے لئے تصور کرسکتے ہیں کہ شاید مصنف سنیتا کے کچھ خیالات کی تائید کر رہا ہے لیکن پھر بھی یہ صاف ہے کہ مصنف اور سنیتا کا کردار ایک نہیں ہے۔

مصنف اور مزدوروں کے نظریات میں بھی اختلاف ہے۔ مزدوروں کا نعرہ یہ تھا کہ مل کو آگ لگا دو، جس کو انھوں نے عملی جامہ پہنایا۔ مصنف کے نزدیک یہ عمل غلط تھا۔

اب صرف ایک کردار ایسا رہ گیا ہے جو مصنف کی زبان بن سکتا ہے اور وہ ہے مل مالک رتن کمار۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصنف کسی کردار کی آڑ لینے کے بجائے علٰحدہ کھڑا ہو کر اظہارِ خیال کر سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے اور یہی ساری کہانی کو الجھا دینے والا مسئلہ ہے۔ لیکن جب ہم کہانی کے مختلف حصوں پر روشنی ڈالیں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ مصنف کبھی کبھی اپنی کمینٹری (COMMENTARY) دیدیتا ہے لیکن دراصل وہ مالک رتن کمار کا ہمنوا ہے۔

افسانے کے پہلے ہی پیراگراف میں مصنف کے فلسفہ زندگی کی جھلک مل جاتی ہے۔

"موسم کے تغیرات اور ہوا کے تند و تیز جھکڑوں کو سہنے والا برگد کا بوڑھا درخت اپنی جگہ پر اٹل کھڑا ہے۔ اور جب ہوا خاموش ہوتی تھی تو ایسا معلوم پڑتا تھا کہ زندگی کی ابدیت کی علامت اہرام مصر کے پاس زمین میں نصب ابوالہول کی مانند دنیا والوں کو خاموش زبان میں نصیحت کر رہی ہے کہ زندگی جاری رہتی ہے اور اس کے بارے میں شبہ ظاہر کرنا محض ایک خیالِ خام ہے اور دنیا کو الٹ پلٹ کر دینے کے ارادے ایسے ہی ہیں جیسے کہ انسان کا لاکھوں ٹن وزنی چٹان کو دو ہاتھوں سے آگے سرکانا ——— چٹان وہیں قائم رہتی ہے اور انسان ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا انسان پھر کوشش میں لگ جاتا ہے۔ بوڑھا برگد بھی ایک چٹان تھا ۔۔۔۔"

مصنف دنیا کو بدل کر نئے نظام کی تشکیل کرنے کے عام ارادوں کو ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے مترادف سمجھتا ہو وہ کیسے زندگی اور ادب کے صحت مند شعور کا ترجمان ہو سکتا ہے۔

افسانے کی ہیروئن سنیتا ہے۔ سنیتا کا نام پڑھ کر پہلا خیال یہی ذہن میں آتا ہے کہ وہ کوئی ناز و نعم میں پلی خوبصورت رومانٹک لڑکی ہے۔ لیکن جب وہ مزدوروں سے ہمدردی جتلانے لگتی ہے تو ہنسی کے بجائے رونا آجاتا ہے۔ سرمایہ و محنت کی شدید کشمکش کے اس دور میں بھی مصنف اس قسم کی مضحکہ خیز باتوں میں یقین رکھتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ سرمایہ دار کی لڑکی ہونے کے باوجود سنیتا اپنے طبقے کے خلاف مزدور تحریک کی ہمدرد ہو جائے لیکن اس کی خاص وجوہ ہونی چاہئیں۔ نیکی اور بدی کے ہلکے پھلکے قصے پڑھ کر وہ اس گہرے راز کو نہیں پاسکتی اور نہ ہی وہ سنہری جلدوں والی کتابیں پڑھ کر سرمایہ داری کو ختم کرنے کے خواب دیکھ سکتی ہے۔ مصنف یہ بھول گیا ہے کہ اس سے زیادہ اثر انگیز اس کا

بورژوا ماحول ہے جس کے مقابلے میں محض کتابوں کا مطالعہ کافی نہیں ہے۔ بورژوا ماحول کے زیر اثر جس بورژوا ذہنیت اور طور واطوار کی تشکیل ہوتی ہے اس کی تلافی بڑی جدوجہد کرنے اور مزدور تحریک میں عملی حصہ لینے کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔ سنیتا کے کردار میں اس غیر معمولی تبدیلی کا دکھانا مصنف کا معجزہ ہے۔ ورنہ ایسا حادثہ روزمرہ کی عملی زندگی میں پیش نہیں آسکتا۔ سنیتا اور مزدوروں کے درمیان کوئی ایسی تار نہیں جسے باندھ کر سنیتا مزدوروں کے پاس چلی آئے۔ اِس قسم کی باتیں اکثر فلموں میں دیکھنے میں آجایا کرتی ہیں لیکن جب ایک ادیب ایسے غلط نظریے کو ادب میں بھی سمونا شروع کر دے تو اس ادب کو افسوسناک ہی کہا جائیگا۔ مصنف نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ کمرے میں گدے دار کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس نے سندر جلدوں والی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں جس میں انسان کی برابری کی تلقین کی جاتی کہ سب برابر ہیں۔" اس فقرے کی تفسیر اسی طرح سے کیجا سکتی ہے کہ مصنف نے سوسائٹی لیڈیز کی جھوٹی اور سطحی زندگی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو بال روم میں اشتراکیت پر بحث و مباحثہ کر کے اپنے آپکو اشتراکی مشتہر کرتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اُن سچے اشتراکیوں کو بھی بورژوا اور آرام پرست سمجھتا ہے جو غریبوں سے جذباتی ہمدردی رکھتے ہیں۔ پہلی تفسیر قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ افسانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسری کچھ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ مصنف نے اس بات کو طنزیہ پیرایہ میں استعمال کیا ہے۔ دوسری تفسیر کو اس حقیقت سے بھی تقویت ہوتی ہے کہ اگر مصنف اسے اس مذکورہ معنی میں نہیں لے رہا ہے تو اسے مقابلے کے طور پر (اگر کوئی کردار ممکن نہیں) تو کوئی اشارہ یا کنایہ پیش کرنا چاہیئے تھا۔ اِس حقیقت سے مصنف کے مقصد پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

سنیتا اشتراکیت کے صحیح فلسفے کے بارے میں کئی غلط فہمیوں کا شکار ہے جسکی وجہ سے وہ کسی مزدور تحریک کی ہیروئن نہیں بن سکتی ہے۔ وہ سرمایہ و محنت کے تضاد کی بنیادی وجہ کو نہ سمجھ کر کھوکھلی جذبات پرستی سے کام لیتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ چیزوں کو برابر بانٹ دینے کو ہی دنیا کے دکھوں کا علاج سمجھتی ہے۔ کسی بھی سماج میں اس کے افراد میں چیزیں برابر بانٹی نہیں جائیں گی۔ اشتراکی سماج میں ہر آدمی کو اس کی محنت کے مطابق پورا پورا صلہ دیا جائیگا۔ ظاہر ہے چیزوں کی بانٹ میں ضرور فرق رہے گا۔ اشتمالی سماج میں ہر فرد اپنی پوری قوت سے کام کریگا اور ضروریات زندگی کے مطابق حصہ لیگا۔ یہ برابر برابر بانٹ سوشلزم کا کوئی سائنٹفک نظریہ نہیں ہے۔ سنیتا کی سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ دنیا کے سب دکھ دور ہو سکتے ہیں اگر مل مالک اپنی ملیں خود مزدوروں کو سونپ دیں۔ سرمایہ دار خود بخود پُرامن طریقے سے ملیں مزدوروں کو نہیں سونپ دیں گے۔ یہ نظریہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ دنیا کے دُکھ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتے جب تک کہ سرمایہ داری کا خاتمہ کر کے اشتراکیت کی نیو نہیں ڈالی جاتی۔ اِس لئے سنیتا کا بار بار یہ کہنا اور سوچنا کہ مل مالک ملوں کو مزدوروں کو سونپ دیں گے۔ زمیندار کاشتکاروں میں زمین برابر برابر بانٹ دیں گے، بالکل غلط بات ہے اور قارئین میں غلط فہمیاں پھیلانے کا موجب بن سکتی ہے۔ رتن کمار سے بات چیت کرنے کے بعد سنیتا کا غصہ بڑھنے لگا۔ انسان کو غصہ اس وقت آتا ہے جبکہ وہ ایک چیز کی برائی کو شدت سے محسوس کر رہا ہو، اور جب سنیتا کو غصہ آتا ہے تو ظاہر ہے کہ مزدوروں کے رنج و محن اس کی زندگی کے غم و الم بن چکے ہوں۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو مصنف کا یہ فقرہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے کہ "بوڑھے برگد سے نفرت کے باوجود وہ اپنا بیشتر وقت تیسری منزل والے کمرے ہی میں گزارنے لگی" حالانکہ اُسے مزدوروں کے جلسے میں جھنڈا اٹھائے اور لاٹھیاں کھاتے نظر آنا چاہیئے ورنہ اُسے غصہ نہ آنا چاہیئے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ سنیتا نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے وہ مزدوروں سے تو جذباتی ہمدردی بھی پیدا نہیں کر سکتا کیونکہ اس تصویر کا رنگ روپ ہی مصنوعی ہے اِس لئے مصنف کو متضاد باتوں کا سہارا لینا پڑا۔ سنیتا جب مزدوروں کو یہ یقین دلاتی ہے کہ وہ

پتاجی سے مزدوروں کی بات منوا کر رہیگی تو وہ طبقاتی جد و جہد کو بالکل بھول جاتی ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ اُسے اس کے پتاجی کی محبت مزدوروں کی باتیں منوانے میں مددگار ہوگی۔

سنیتا مزدوروں کو وحشی اور غیر مہذب سمجھتی ہے ورنہ اس کے اس خواب کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ جاتا کہ مزدور اس کے باپ کو گرا کر اس کی ہڈی پسلی توڑ رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ خواب تحت الشعور کی تاریکیوں میں کھوئے ہوئے خیالوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ سنیتا سمجھتی ہے کہ کہ مزدور انفرادی تشدد پر یقین رکھتے ہیں۔ مزدور طبقہ اپنے اجتماعی عمل سے نئی سماج کی تشکیل کرتا ہے مگر وہ انفرادی دہشت انگیزی کو اپنے مقاصد کی تکمیل کا راستہ نہیں سمجھتا۔ سنیتا مزدوروں کے جلسے میں اس طرح جا کر تقریر کرتی ہے جیسے کوئی مہارانی کسی ہسپتال میں زخمیوں کا معائنہ کرتی ہے اور ہمدردی کے چند الفاظ بولتی ہے۔

ہڑتال سے پیشتر کسی قسم کا سمجھوتہ نہ ہونے کی صورت میں سنیتا غمگین ہو جاتی ہے اور وہ بے بس ہو کر رونے لگتی ہے۔ مصنف نے ایک فرد کے رول کو مزدور تحریک میں جو اہمیت دی ہے اولاً تو وہ ہی غلط ہے اور پھر اُس پر طرہ کہ وہ مزدور سبھا کا کوئی کارکن نہیں بلکہ ایک سرمایہ دار کی لڑکی ہے۔ مصنف کے افسانوی سٹنٹ کی داد دینی پڑتی ہے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ سنیتا کے کردار کے ذریعے مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے تو بخوبی کہا جا سکتا ہے کہ مصنف ذہنی انتشار اور متوسط طبقے کی مزاجی ذہنیت میں بری طرح جکڑا ہوا ہے اور مزدور طبقہ کو دور سے دیکھنے کی وجہ سے وہ اِس قسم کی "فلمی" باتوں کی اشاعت کر رہا ہے۔

اس افسانے میں مزدوروں کے رول کو لیجئے تو اور بھی مایوسی ہوتی ہے۔ مزدور تنخواہ میں نئی کٹوتی کے خلاف اپنی آواز اٹھانے کے لئے بوڑھے برگد کے پیڑ کے نیچے اکٹھے ہوئے ہیں۔ مزدور راہ نما کی تقریر کا تذکرہ اس مقام سے کیا گیا ہے جب وہ کہہ رہا تھا۔

"میں نے تم سے ابھی ابھی کہا کہ مِل پر حق مزدوروں کا ہے مالک کا نہیں۔ ہم اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں مشینوں سے زور آزمائی کرتے ہیں۔ لوہے سے مقابلہ مول لیتے ہیں۔ ہماری ہڈیاں چٹخنے لگتی ہیں۔ جوڑ جوڑ میں درد ہوتا ہے اور کھانے کو ملتی ہیں صرف وہی سوکھی روٹیاں اور دودھ ندارد ———" یہ تقریر پڑھ کر مصنف کی آج کے مزدور لیڈروں اور مزدوروں کی تحریک سے لاعلمی عیاں ہوتی ہے۔ آج مزدور اپنے حقوق و سماج میں اپنی حیثیت کے بارے میں ایک خاص شعور رکھتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مستقبل کی دنیا اس کی بنائی ہوئی ہوگی۔ اور وہ جذباتی تقریریں نہیں سنتے۔ آج کا مزدور "مِل کو آگ لگا دو" کا نعرہ نہیں لگاتا ۔ اٹھارہویں صدی میں جبکہ انگلینڈ میں مزدور تحریک کا آغاز ہی ہوا تھا اس قسم کی باتیں ممکن تھیں۔ لیکن آج بیسویں صدی ہے اور مابعد از جنگ کا زمانہ ہے۔ جب مزدور طبقہ اور مزدور کارکن مل کو آگ لگا دو کا نعرہ نہیں دیتے، بلکہ نئے نظام کے لئے جد و جہد کرتے ہیں۔ جس میں ملوں کی ترقی ہوگی۔ وہ ملوں کو مزدوروں کا دشمن نہیں سمجھتے بلکہ اس نظام کو مٹانا چاہتے ہیں جس میں مل ایک خاص فرد یا محدود طبقے کی ملکیت بن کے رہ گئی ہے۔ مزدور طبقہ اپنے دشمنوں اور دوستوں کو پہچاننے لگا ہے۔ جس جلسے میں مزدور سبھا کے راہ نما اور اپنے حقوق کی حفاظت اور انکی تکمیل کے نعرے لگنے چاہئیں وہاں سنیتا دیوی جی کی جے ہو رہی ہے۔ بیدار مزدور بیوقوف نہیں ہیں اور وہ خالی کھوکھلی جذباتی باتوں پر یقین نہیں لا سکتے۔ آگے چل کر پرتھوی ناتھ شرما مزدور کارکن پر ایک اور وار کرتے ہیں ۔ جب رتن کمار مل مالک مزدوروں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو سب سے بڑا ہڑتالی لیڈر ہر بار کہتا "آپ ہمکو بہکا رہے ہیں، یہ سب سرمایہ دارانہ چالیں

ہیں۔ آپ لوگوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ انقلاب۔" مصنف نے یہ جملے طنزیہ پیرایے میں لکھے ہیں، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مزدور لیڈر خواہ مخواہ ہی مل مالکوں کی جائز اور صحیح باتوں کو بھی سرمایہ دارانہ چالوں کے نام سے مطعون قرار دیکر مزدوروں کو ہڑتال کرنے پر اکساتے ہیں۔ اِس طرح مصنف سرمایہ داروں کی پیروی کر رہا ہے۔ خود مصنف کے الفاظ میں اس کا ثبوت پنہاں ہے۔ مصنف نے اس سلسلے میں لکھا ہے۔ "مل کو آگ لگادو، ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔ بھوک کی اگنی اندر اندر جو دہکتی ہے، لیکن وہ خیالات کے غلام تھے۔ ایک طاقتور خیال نے ان کو اپنے قابو میں کر رکھا تھا وہ شاید یہ بات نہیں سمجھتے تھے کہ قحط کی صورت میں ہر انسان پر اثر پڑتا ہے۔ اگر اناج کا ایک دانہ بھی نہ رہے تو کون بانٹے اور کون کھائے۔" کتنی اچھی طرح سرمایہ داروں کی وکالت کی گئی ہے۔ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں "پیداوار کم ہے۔ مل نقصان میں چل رہی ہے۔ ہڑتال کرنا تو تمہاری عادت بن چکی ہے۔ جب تک پیداوار زیادہ نہ ہو گی تو تمہاری تنخواہوں میں اضافہ کیسے ہو۔ جب تک مل نقصان میں چلیگی کٹوتی کرنی ہی پڑیگی۔ وہ شاید نہیں سمجھتے تھے کہ قحط کی صورت میں ہر انسان پر اثر پڑتا ہے۔ اگر اناج کا ایک دانہ بھی نہ رہے تو کون بانٹے اور کون کھائے۔" اس لئے ہڑتال مت کرو اور پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کرو۔ دو وقت کی روٹی نہ سہی ایک ہی وقت سہی۔ ویسے تو مزدور چنے کھا کر اور پانی پی کر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ اور قحط کے دنوں میں ہر زمیندار اور سرمایہ دار اور حاکم کی تجوریاں بھرتی جاتی ہیں۔ اِس لئے اگر مزدور کم تنخواہ پر کام کرتے رہتے تو مل سال چھ مہینہ میں بجائے ختم ہو جانے کے آگے کی طرف بڑھتی۔ مگر اب چارہ ہی کیا تھا۔ اگر مل مالک رتن کمار شاعر ہوتا تو وہ بھی اپنے مطلب کو تشبیہوں اور استعاروں سے اسی طرح واضح کرتا۔

مصنف نے مزدوروں پر انفرادی دہشت انگیزی کا الزام بھی لگایا اور یہ بھی بتلایا کہ انہوں نے مل کو آگ لگادی۔ مزدور طبقے کی یہ تصویر مصنف کے اپنے دماغ کا کرشمہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ آج مزدور تحریک اتنی منظم اور بیدار ہو چکی ہے کہ اس میں ملوں کو آگ نہیں لگائی جاتی۔ انفرادی دہشت انگیزی سے کام نہیں لیا جاتا۔ جذباتی تقریریں نہیں سُنی جاتیں اور سنتا دیوی کی جے کے نعرے نہیں لگائے جاتے۔

آخر میں صرف ایک کردار رہ جاتا ہے جو مصنف کی زبان بن سکتا ہے۔ وہ کردار مل مالک رتن کمار کا ہے۔ مصنف نے اپنے آپ کو غیر جانبدار ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ بالکل فریب ہے۔ آج جبکہ جماعت انسانی دو طبقات میں بٹی ہوئی ہے۔ غیر جانبداری عوام سے غداری کے مرادف ہے۔ مصنف نے جہاں مزدوروں اور اس کے کارکنوں کی باتوں کو نعرہ زنی میں ٹال دینا چاہا انکی باتوں کو دو تین فقروں سے آگے نہیں بڑھنے دیا اور وہ باتیں بھی ایسی کہلوائیں جو گمراہ کن تھیں وہاں سرمایہ دار کو ایک شریف آدمی کا درجہ دیا ہے جسکی باتیں منطق اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مل مالک کی باتوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ظاہر میں باتیں تو وہی ہونگی جن کی تشہیر ایک سرمایہ دار ہڑتال توڑتے کے وقت کرتا ہے۔ پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصنف سرمایہ دار کی باتوں کو بعینہ اس لئے لکھتا ہے کہ اس کی چالوں کو فاش کیا جائے، یا مصنف نے حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ لیکن افسانے کے بغور مطالعہ سے یہ بات عیاں نہیں ہوتی۔ کیونکہ مصنف جن باتوں کا بیان اپنی زبان سے کرتا ہے، وہ سرمایہ دارانہ دلائل کو رد نہیں کرتیں بلکہ ان سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ جب مصنف کے دلائل اور مل مالکوں کی باتوں میں کوئی فرق نہیں رہ جائیگا تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ مصنف نے سرمایہ دار طبقہ کی وکالت کی ہے۔ مصنف کے اُن فقروں کو پڑھئے جو اُس نے کسی کردار کے منہ سے نہیں کہلوائے بلکہ اپنی طرف سے لکھے ہیں۔

"رتن کمار جواب دیتے ہڑتالیوں کا غصہ ترقی پا جاتا اور وہ زور زور سے آواز لگاتے، مل کو آگ لگا دو۔ اُن کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔ بھوک کی اگنی جو اندر اندر دہکتی تھی۔ لیکن وہ خیالات کے غلام تھے۔ ایک طاقتور خیال نے ان کو اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ وہ شاید یہ بات نہیں سمجھتے تھے کہ قحط کی صورت میں ہر انسان پر اثر پڑتا ہے۔ اگر اناج کا ایک دانہ بھی نہ رہے تو کون بانٹے اور کون کھائے؟"

آگے چل کر مصنف رقمطراز ہے۔

"رتن کمار کو مل بند کرنے کا بڑا افسوس تھا۔ سینکڑوں بھوکی آنکھیں ان کے سامنے گھورتی رہتی تھیں، لیکن وہ کیا کرتے۔ ایک خیال تھا جو مزدوروں کے دماغ میں پیوست ہو گیا تھا کہ وہ ظالم ہے۔ وہ مزدوروں پر بیجا ظلم روا رکھتے ہیں۔ ممکن تھا کہ اگر وہ لوگ کم تنخواہ پر کام کرتے رہتے تو مل سال چھ مہینہ بجائے ختم ہو جانے کے اور آگے کی طرف بڑھتی، مگر اب چارہ ہی کیا تھا۔"

ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے مصنف سرمایہ داروں کا معاشی مشیر کار ہے۔

اِس کے بعد افسانہ مل مالک کا ان جملوں پر اختتام کے قریب پہنچتا ہے۔ اگر مصنف سرمایہ داروں کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے تو یہ فقرے بالکل مختلف ہونا چاہئیں۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔

"مل انسانی خیالات کے جھگڑوں کی نذر ہو گئی۔ کیا پتہ اب اِسی جگہ میرے ہی ہاتھ سے ایک نئی مل کھڑی ہو یا کوئی دوسرا آدمی دوسری جگہ کسی اور نئی مل کی بنیاد ڈالے۔ جب تک انسان زندہ ہے وہ مزدور بھی رہے گا اور مل مالک بھی۔ شکل بے شک بدل سکتی ہے۔ روپ دوسرا ہو سکتا ہے۔ لیکن باتیں تقریباً وہی رہتی ہیں۔ مالک۔ مزدور۔ چھوٹا مزدور۔ بڑا مزدور۔۔۔۔"

افسانے کے اختتام پر مصنف کے اپنے الفاظ کافی اہم ہیں اور اس کے نظریے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی بیخ کنی کرنا لاحاصل ہے۔ (شاید وہ صنعتی سمجھوتے کے قایل ہیں) 'بوڑھا برگد میدان میں خاموش لیٹا تھا۔ سیتا خاموش تھی۔ بوڑھے برگد کے اکھڑ جانے اور مل میں آگ لگ جانے کے دو عملوں میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور تھا۔ سایہ ختم ہو گیا تھا۔ انسان پاگلوں کی مانند دوسرے سایہ دار درخت کی طرف بڑھ رہا تھا۔'

بوڑھا برگد اگر سرمایہ داری کی علامت ہے تو اُس کے جڑ سے اکھڑ جانے میں کوئی برائی نہیں۔ مل کو آگ لگانا واقعی غلط عمل ہے لیکن یہ عمل سرمایہ دارانہ نظام کو بنیادی طور پر مٹا دینے کا عمل نہیں ہے۔ اس لئے بوڑھے برگد کے جڑ سے اکھڑ جانے اور مل کو آگ لگانے کے دو عملوں کو ایک ہی سمجھنا مصنف کی غلطی ہے۔ بوڑھے برگد کو ہر کردار نے مختلف پہلوؤں سے دیکھا ہے۔ تاہم بوڑھے برگد کی علامت قارئین کے ذہن میں الجھنوں کو بڑھا دیتی ہے۔ یہ افسانہ سوائے ذہنی انتشار کے اور کوئی تاثر نہیں چھوڑتا۔

افسانہ کا کوئی کردار زندگی اور مزدور تحریک کا صحت مند تصور نہیں رکھتا۔ مصنف کی غیر جانبدارانہ رائے بھی غیر صحت مندانہ ہے۔ ایسے افسانوں سے مزدور دشمن نظریے کی اشاعت ہوتی ہے۔

جوش ملسیانی

اُن سے ہم ترکِ تغافل کا تقاضا نہ کریں
اس کا مطلب یہ کہ جینے کی تمنا نہ کریں

وعدہ کر کے وہ اگر وعدے کو ایفا نہ کریں
اس سے بہتر تو یہی ہے کوئی وعدا نہ کریں

یہ تو اے شرطِ محبت کوئی انصاف نہیں
ہم تمنا تو کریں عرضِ تمنا نہ کریں

اُن سے توقیرِ محبت نہیں ہوتی نہ سہی
اتنی تحقیرِ محبت بھی خدارا نہ کریں

زندگانی کا سہارا میں سمجھتا ہوں اُنہیں
جو مرے جان سے جانے کی بھی پروا نہ کریں

جبر کو ضد ہے کہ فریاد پہ فریاد کرو
صبر کو ڈر ہے کہ نالے مجھے رسوا نہ کریں

ضبطِ الفت تو ہوا جاتا ہے اک نشترِ غم
کیا کریں ہم اگر اظہارِ تمنا نہ کریں

انکی عادت کہ وفاؤں پہ بھی ہوں چیں بہ جبیں
اپنی فطرت کہ جفاؤں کا بھی شکوا نہ کریں

المدد انکی زباں پر بھی ہے اے گردشِ دہر
جن کو عادت تھی کہ احسان گوارا نہ کریں

وعدۂ حشر پہ بھی جوشؔ یہ شک ہے مجھ کو
کہیں ایسا نہ ہو وہ اس کو بھی ایفا نہ کریں

جگر مرادآبادی

(فارسی کی ایک تازہ اور ادھوری غزل)

بہ سرِ تو ساقیِ مست، من بہ سرورِ بے طلبی خوشم
اگرم شراب نمی دہی بہ خمارِ تشنہ لبی خوشم

چہ خوش ست ذوقِ محبتم چہ بلاست لذتِ فرقتم
کہ بہ یادِ زلفِ سیاہِ تو بہ ہجومِ تیرہ شبی خوشم

زنگاہِ عشوہ طرازِ تو چہ گزشت بر دلِ من کہ من
نہ بہ نالۂ سحری خوشم نہ بہ آہِ نیم شبی خوشم

زجفائے حسنِ تمامِ تو نہ شکایتے نہ حکایتے
چہ حکایتے چہ شکایتے کہ بہ ترکِ بے ادبی خوشم

چہ مقامِ عشق و چہ منزلے کہ دریں زماں منِ بے دلے
نہ بہ شاہدے، نہ بہ مطربے، نہ بہ حاصلِ طلبی خوشم

ساحر ہوشیارپوری

(جگر کے فارسی اشعار اُردو قالب میں)

میں اسیرِ ذوقِ طلب نہیں، جو نہیں شراب تو کیا ہوا
مجھے بے پیئے ہی سرور ہے، مجھے تشنگی بھی ہے کیف زا

تری زلفِ شبگوں کی یاد بھی، ہے نویدِ بختِ سیاہ کو
میں نثارِ لذتِ ہجر ہوں، مجھے ذوق ایسا ہوا عطا

نہ تو نالۂ سحری سے خوش، نہ تو آہِ نیم شبی سے خوش
تری چشمِ عشوہ طراز نے، مرے دل پر ایسا فسوں کیا

کروں ظلم و جور کا کیا گلہ، کہوں کیا فسانۂ حالِ دل
یہ شکایتیں یہ حکایتیں، تری بارگہ میں نہیں روا

نہ غرض ہے حسن و سرود سے، نہ طلب نشاطِ شراب کی
یہ مقام بھی کیا مقام ہے، مری بے نیازیٔ شوق کا

منظر سلیم

غیر کی تسلی سے کم تو خیر کیا ہوتا
غم جو آج شعلہ ہے داغ بن گیا ہوتا
یوں بھی ہم نے طے کی ہیں جانے منزلیں کتنی
سوچتے ہیں آج اگر کوئی آسرا ہوتا
تشنگی کے باعث ہم بدگماں نہیں ساقی
جام ہم تک آجاتا پھر چھلک گیا ہوتا
دل کو مطمئن پا کر وار کر گئی دنیا
ہم سنبھل گئے ہوتے، غم اگر نیا ہوتا
ہم بھی دیکھتے کوئی کیسے مسکراتا ہے
ہاتھ سے کسی کے اور، جام چھن گیا ہوتا
اک تری محبت کی یادگار ہے ورنہ
منزلِ غمِ دل سے میں گزر گیا ہوتا
آج اپنی رسوائی باعثِ سکوں ہوتی
غیر کو اگر منظر نام مل گیا ہوتا

کیلاش بہاری موج

اب شبِ انتظار ڈھلتی ہے
زندگی راستہ بدلتی ہے
روز طوفان، روز ہنگامے
دل کی عادت کہیں بدلتی ہے
خود سنبھل جائیں قافلے والے
رہبروں کی نظر بدلتی ہے
جس کی خوشبو سے بس گئیں صدیاں
زندگی وہ لہو اُگلتی ہے
ہمنشیں! دیکھ اس اُفق کے پار
جلوۂ نو کی جوت جلتی ہے
اب سویرا ہوا محبّت کا
تیری پلکوں سے اوس ڈھلتی ہے
خوب بہلائے جا رہے ہیں دل
آج کی بات کل پہ ٹلتی ہے

جمیل ملک

دل و جگر میں درد ہے نگہہ میں اضطراب ہے
نہ پوچھ دوست آج کل تو زندگی عذاب ہے

حسین چاندنی میں آج کون بے نقاب ہے؟
فلک پہ ماہتاب بھی حیا سے آب آب ہے

میں تجھ سے دُور رہ کے بھی ترے قریب ہی رہا
ترے خیال کا امیں مرا ہر ایک خواب ہے

میں رفتہ رفتہ تری بے رخی کو بھول جاؤنگا
مرا رفیق و غمگسار ساغرِ شراب ہے

وہ اور جلوہ گر ہوں یوں مری نظر کے سامنے؟
نہیں نہیں یہ وہم ہے، نہیں نہیں یہ خواب ہے

میں بادہ خوار ہوں تو کیا، گناہگار ہوں تو کیا!
یہ بے خودی کا دور ہے یہ عالمِ شباب ہے

قدم قدم پہ دیکھتا ہوں دلفگار حادثے
جمیل زندگی ہے یہ کہ موت کا عذاب ہے

مسعود حسین

مرے خیال میں بنتی گئی ہے لے کی لکیر
وہ آرزو، کہ نہ ڈھل پائی جسمیں اِک تصویر

بڑا کرم ہو ترا، یہ کرم اگر ہو جائے
کہ رازِ غم کی خدایا! کبھی نہ ہو تشہیر

گِنا کرے کوئی ساحل پہ بیٹھا لہروں کو
محبتوں میں بدلتی نہیں کبھی تقدیر

نہ کام آئے گی اُلفت میں کارپردازی
کہ سطحِ آب پہ لکھتا نہیں کوئی تحریر

کوئی بھی سمجھا محبّت کی بے زبانی کو
نہ ہوسکی کبھی گونگے کے خواب کی تعبیر

رشی کے خون سے ٹوٹا وہ برہمن کا طلسم
کہ آج تارِ رگِ سنگ بھی ہے تارِ حریر

سخن میں ڈال کے کب تک کوئی کہے مسعود
میں دل کی بات کہوں وہ اگر نہ ہوں دلگیر

تسنیم سلیم چھتاری

ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اُس نے وقت سے پہلے ہی بچّوں کو چھٹی دیدی اور کتابیں، کاپیاں، قلم، پنسل، سب یونہی میز پر بکھرے چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ چوکیدار نے حسبِ معمول بہت جھک کر سلام کیا، اور وہ خلافِ عادت نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ بوڑھے چوکیدار کی آنکھوں سے حیرانی جھلکنے لگی۔ چھ مہینے میں آج پہلا اتفاق تھا کہ ماسٹر جی نے اس کے سلام کا مسکرا کر جواب نہیں دیا۔ یوں تو وہ کئی دن سے دیکھ رہا تھا کہ ماسٹر جی کچھ کھوئے ہوئے سہمے سہمے سے نظر آتے ہیں۔ وقت سے بہت پہلے ہی اسکول چلے آتے ہیں اور تنہا بیٹھے دیواروں پر ٹنگے ہوئے رنگ برنگے نقشوں کو گھورا کرتے ہیں۔ چھٹی ہو جاتی ہے تو بھی آدھے آدھے گھنٹہ وہ کمرے میں اکیلے بیٹھے اونگھتے رہتے ہیں، اُٹھ کر چلتے ہیں تو چال میں لڑکھڑاہٹ اور شانوں میں جھکاؤ ہوتا ہے پھر بھی وہ بوڑھے چوکیدار کے سلام کا مُسکرا کر جواب دینا نہیں بھولتے۔ یہ مسکراہٹ ہر چند کہ بے جان سی ہو گئی ہے مگر ابھی مٹی نہیں، اور کلو چوکیدار اس مُسکراہٹ سے اتنا مانوس ہے کہ وہ کبھی سلام کے بعد ماسٹر جی کے چہرے پر نظر جما کر اس مسکراہٹ کا ہدیہ قبول کرنے سے نہیں چوکتا ــــ وہ بھی مسکرا دیتا ہے اور ماسٹر جی سڑک پر نگاہ جمائے اپنے کواٹر کی طرف مُڑ جاتے ہیں۔

ابھی جب ماسٹر جی اسکول میں داخل ہوئے تو اُن کے قدم کتنے آہستہ اُٹھ رہے تھے اور گردن کس طرح شانوں پر ڈھلکی ہوئی تھی مگر جب وہ کلو کے پاس سے گزرے تو انہوں نے گردن اٹھالی اور سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ پھیکی سی جانی پہچانی مسکراہٹ پھر ہونٹوں پر تیر گئی۔ کلو پوچھنے ہی والا تھا کہ ماسٹر جی آپ ابھی تک کچھ بیمار سے لگتے ہیں۔ کیا بڑھارحمو ٹھیک طرح آپ کے کھانے پینے کا خیال نہیں رکھتا یا پھر اس گاؤں کی آب و ہوا آپ کو راس نہیں آتی ؟ مگر پہلے تو آپ بہت خوش نظر آیا کرتے تھے۔ آپ چھٹی لے کر ڈاکٹر سے ملنے شہر کے ہسپتال کیوں نہیں چلے جاتے ؟ ــــ مگر کلو یہ سب نہیں کہہ سکا، ماسٹر جی پھاٹک میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ آج جلدی بھی تو نہیں آئے۔ بچے بہت دیر سے برآمدے میں اُن کے منتظر تھے۔ کلو نے سوچا کہ جب وہ اسکول ختم کر کے جائیں گے تو وہ یہ ساری باتیں ضرور پوچھ لیگا!

ماسٹر جی کو جاتے دیکھ کر کلو آگے کو بڑھا اور جھک کر سلام کیا مگر تبسّم کی وہ ہلکی سی لہر کیا، ماسٹر جی نے تو پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر جواب دینے کی ضرورت بھی نہ سمجھی، بس آگے بڑھتے چلے گئے اور کلو دل شکستہ ہو کر دیکھتا رہ گیا۔

جب ماسٹر جی کواٹر کی طرف جانیوالی سڑک پر مُڑ کے نظر سے اُجھل ہو گئے تو کلو اسکول کے کمرے میں تالا ڈالنے کو بڑھا اور اُس نے دروازے ہی سے میز پر بکھری ہوئی کتابیں، کاپیاں اور پنسلیں دیکھ لیں ــــ! ادھر دس بارہ دن سے ماسٹر جی اکثر کبھی کوئی قلم اور کبھی کوئی کاپی الماری میں بند کرنا بھول جاتے تھے مگر آج تو ساری چیزیں بس ہی جوں کی توں پڑی تھیں۔ کلو اور زیادہ حیران ہو گیا، پھر وہ چونکا، سرپوش سے

ڈھکی ہوئی چینی کی وہ پلیٹ بھی رکھی تھی جو امام صاحب کا لڑکا مایوں کے لڈو رکھ کر ماسٹر جی کو دینے لایا تھا ـــــــ کلو نے بڑھکر سرپوش اٹھایا۔ چاندی کے ورق لگے چاولوں کے پانچ لڈو ـــــ ماسٹر جی بھول گئے، کلو نے سوچا!

دروازے میں تالا ڈال کر اور سرپوش سے ڈھکی ہوئی رکابی اٹھا کر کلو ماسٹر جی کے کواٹر کی طرف چل دیا۔ "میں یہ بھی پوچھ لونگا کہ کچھ بیمار تو نہیں ـــــ" ماسٹر جی کے کواٹر پہنچ کر باورچیخانہ والی کوٹھڑی سے دھواں نکلتے دیکھ کر اُس نے جنگلے میں سے جھانکا۔ "رحمو کیا ابھی سے ہنڈیا چڑھا دی؟"

"ہنڈیا کس کے لئے چڑھاؤں گا بھیا جب کوئی کھانے والا ہی نہیں؟" رحمو چلم اٹھاتے ہوئے باورچیخانے سے باہر نکل آیا۔

"کھانا بھی نہیں کھاتے؟" کلو نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا ابھی تک بخار نہیں چھوٹا؟"

"کیا کھاتے ہیں ـــــ رات کی روٹیاں میں نے صبح نپٹائیں اور دوپہر کا کھانا وہ پڑا سٹر رہا ہے ـــــ کیا پتہ بخار آتا بھی ہوگا تو کیا وہ منہ سے کہتے ہیں۔"

"ہیں کہاں؟"

"وہ اُدھر ـــــ وہیں ہوں گے" رحمو نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

اور کلو چوکیدار لڈوؤں کی رکابی لئے مکان کے پچھواڑے جا پہنچا۔

برگد کے طویل وعریض تنے سے کمر لگائے وہ کہیں دور! بہت دور تک رہے تھے...

"ماسٹر جی" کلو کی آواز پر وہ اس طرح چونکے جیسے کلو نے انکی سوچ کو چہرے پر لکھا ہوا پڑھ لیا ہو۔ "کیا ہے چوکیدار؟"

"آپ الماری کھُلی چھوڑ آئے تھے ـــــ یہ کنجیاں ہیں ـــــ اور یہ ـــــ"

"یہ کیا ہے؟" سرپوش سے ڈھکی ہوئی وہ رکابی دیکھ کر ماسٹر جی کا چہرہ سفید ہو گیا۔

"لڈو ہیں! آپ وہیں رکھ کر بھول آئے تھے! امام صاحب کے یہاں سے جو مایوں کے لڈو اُن کا لڑکا لایا تھا نا ـــــ"

"مایوں کے لڈو" ماسٹر جی کا سانس چڑھنے لگا۔ "لیجاؤ انہیں، کلو تم یہاں سے جاؤ۔ مجھے نہیں چاہئیں یہ لڈو ـــــ لے جاؤ یہاں سے ـــــ" اور اس سے قبل کہ کلو چوکیدار ماسٹر جی کی بدحواسی کا مطلب سمجھے وہ تیز تیز قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

کلو نے پلٹتے پلٹتے برگد کی گھنیری شاخوں کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "یہ ہردم برگد کا سایہ بھلا نہیں! امام صاحب اپنی بٹیا کی شادی سے نپٹ لیں تو اُن سے کسی دم درود کی کہوں گا!"

بیچارے ماسٹر کو قسمت نے اپنے تمام تر تلخ تجربات کا مرکز بنایا تھا، اُسے اپنی زندگی میں سکون ومسرت کا ایک لمحہ بھی تو یاد نہیں تھا۔ بچپن سے اُسے سوتیلی ماں کے مظالم نے کچلا اور اسکول میں ساتھی اس کی اوندھی سیدھی حرکتوں اور رونی صورت کا مذاق اڑاتے رہے دراصل اس میں مقابلے کی کبھی تاب نہیں رہی، لہذا باپ کے چپکے چپکے پوچھنے پر نہ کبھی ماں کی شکایت کرسکا اور نہ دوستوں کی فقرہ تراشیوں کا

اس کے پاس کوئی جواب تھا۔ بس وہ تنہائی میں آنسو بہالیتا اور پھر اس بوجھل زندگی کی گاڑی کو کھینچنے میں مصروف ہو جاتا اور یونہی ایکدن جب اس کے میٹرک میں پاس ہونے کی خبر آگئی تو بھی باپ کی لاش کی پائنتی بیٹھے وہ اپنے خون کی گردش میں ذراسی بھی تیزی محسوس نہ کر سکا تھا۔

باپ کی موت نے اس کا رہا سہا سہارا بھی ختم کر ڈالا۔

اُس نے پہلی بار مصیبتوں سے فرار کی کوشش کی، دراصل اُسے مجبور کر دیا گیا۔ سوتیلی ماں نے پچاس ہزار کی مہر کا دعویٰ کر کے گھر، زمین، نقد سب کچھ ہتیا لیا اور وہ گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کے باپ تھانیدار تھے اور اس کے لئے ہمیشہ کلکٹری کے خواب دیکھا کرتے تھے، انھوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ تمہیں آئی سی ایس کرنا ہے، مگر اس کی تعلیم دسویں کلاس پر ہی ختم ہو گئی اور اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا، اسے اسکول کی چہار دیواری سے ماسٹروں سے ساتھیوں سے کتابوں سے اور دیوار پر ٹنگے ہوئے نقشوں سے سخت نفرت تھی اور کالج میں جانے کے خیال سے تو سچ مچ اس کا دل بیٹھتا تھا وہ جانتا تھا کہ سوکھے ہونٹ اور بھیگی پلکیں باتوں سے بچاؤ اور کھیل سے بیزاری اُسے کہیں کا نہ رہنے دیگی وہاں وہ اور بھی ذلیل کیا جائیگا اور فقرے اور قہقہے —— مگر اب کسی بات کی گنجائش ہی کہاں تھی ذرا ذرا سی ٹھیس پر تو آنکھیں جھک جاتیں۔ اُس نے جانے پہچانے شہر گھر اور انسان سب کو چھوڑ دیا —— ایک بھی تو اس کا ہمدرد نہ تھا۔

مستقبل کے لئے کوئی راہ ڈھونڈنا بہت مشکل ثابت ہوا۔ اُسے بھی ڈر تھا کہ لوگ اُس کے ساتھ بدسلوکی کریں گے اُسے ذلیل سمجھیں گے وہ ملتے جلتے گھبراتا تھا اور اس کے بغیر کوئی ذریعہ محال تھا۔ اُس نے کچھ دنوں ادیب بننے کی مشق بھی کی مگر اس کے افسانہ کسی اشتہاری رسالے نے بھی تو نہ چھاپے اور وہ اچھی بھلی چیز کیا کوئی بغیر قافیے والی نظم بھی تو نہ کہہ سکا۔ تھک کر وہ مرحوم باپ کے ایک دوست سے ملنے گیا جنکی سفارش سے وہ اپنی مرضی اپنے دل اور اپنے سارے منصوبوں کے خلاف اسکول ماسٹر بنا دیا گیا۔

زندگی کا یہ رُخ اُسے بہت گراں گزرا، اُسے بار بار کہیں آسمان کی بلندیوں اور زمین کی گہرائیوں سے اپنے باپ کی آواز سنائی دیتی "مگر تم تو آئی سی ایس کا امتحان دینے والے تھے بیٹا!" اور باپ کی خواہش پوری نہ کرنے پر وہ اس قدر خائف تھا کہ جب وہ گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکلا تو آخری بار اپنے باپ کی قبر پر بھی تو نہ جا سکا۔ کہیں وہ پھر نہ کہیں کہ ——

دو سال تک وہ ایک گاؤں میں چھوٹے بچوں کو پڑھاتا رہا اور دو سال کے ہر مہینے ہر ہفتے اور ہر دن وہ پہلے سے زیادہ بزدل ہوتا چلا گیا۔ اس خاموش اور سنجیدہ مزاج ماسٹر جی کے بارے میں گاؤں کے لڑکوں نے وثوق سے خبر اڑا دی کہ وہ افیم کھاتے ہیں اور پینک میں رہتے ہیں۔ اور جب اسے پتہ چلا تو وہ اتنا گھبرایا کہ جو سچ مچ اُس کے پاس افیم ہوتی تو وہ جی بھر کے کھالیتا —— پھر وہ ہوشیار رہنے لگا، کبھی سر جھکائے بیٹھا ہوتا تو خیال کر کے چونک جاتا اور بچوں پر کڑی نظر رہنے لگی۔ "یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟ تمہارا خیال ہے کہ میں تمہاری طرف سے بے خبر ہوں، تم سیدھی طرح کیوں نہیں بیٹھتے؟ کیا میں اندھا ہوں تمہیں دیکھ نہیں رہا؟ تم کتاب پڑھ رہے ہو یا منہ چڑا رہے ہو، مجھے سمجھ لیا ہے؟؟؟" وہ بار بار انہیں جتاتا —— اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا کرتا، پتلی سی پگڈنڈی، کھیت اور کنواں! دن بھر کنوئیں پر کانسی کے بھوتے اور کانچ کی چوڑیاں چھنکتیں ساریاں اور دوپٹہ لہراتے گالی گلوچ ہوتی، طعنے طنز چلتے، بچوں کے رشتے اور منگیتروں کی باتیں ہوتیں، ساس نندوں کی سختیاں اور خاوندوں کے لاڈ چوچلے کہے سُنے جاتے —— وہ کھڑکی میں سے

رنگ رنگیلے لباس اور چہرے دیکھتا رہتا اور سمجھ میں نہ آنیوالی باتیں سنتا رہتا، جیسے اُسے چوکنا رہنے کا بہانہ مل گیا ہو، مگر پھر جانے کیا ہوا کہ پنگھٹ کے میلے آپ سے آپ پھیکے پڑنے لگے، ہنسی ٹھٹھے کم ہوتے ہوتے سٹ کر رہ گئے۔ لال پیلی ساڑیاں اور ہری بسنتی چوڑیاں بھی نظر نہ آتی تھیں۔ دو چار بوڑھی عورتیں پانی بھرنے بھی آتیں تو بس بڑبڑاتی ہی رہتیں..... اُسے الجھن ہونے لگی۔ "کیا بات ہے اب پہلے کی طرح اس کنوئیں پر پانی بھرنے کوئی نہیں آتا؟" اُس نے ایک بچے سے پوچھ لیا۔ "ہاں اب سب عورتیں بنواڑی کی دکان کے آگے جو کنواں ہے وہاں پانی بھرنے جاتی ہیں۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"کیوں اس کنوئیں کا پانی کچھ خراب ہو گیا ہے؟" وہ غیر ارادی پوچھ بیٹھا۔

لڑکے نے اُسے کوئی جواب دینے کے بجائے ایک دوسرے لڑکے کو دیکھا اور پھر وہ دونوں ہنسنے لگے، ماسٹر نے گھبرا کر کھڑکی سے باہر گردن نکالدی!

مگر جلد ہی اس کو وجہ بھی معلوم ہو گئی، جب چوپال پر باقاعدہ بڑے بوڑھوں کی پنچایت نے ایک رات یہ تذکرہ چھیڑا کہ "کیا ماسٹر کے ماں بہن نہیں ہیں جو ہماری بہو بیٹیوں کو گھورتا ہے —— تبادلہ ہونا چاہیئے!" اور تبادلہ ہو گیا۔

جب وہ یہاں پہنچا تو دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پی رہا تھا، یہ دیکھ کر تھوڑا بہت سکون ہوا کہ اسکول گاؤں کی آبادی سے کچھ ہٹ کر واقع ہوا ہے اور بچے بھی اس قدر بدمعاش نہیں کہ بیچارے ماسٹر پر شرابی یا افیمی ہونے کا الزام لگادیں۔ ایک دن اُسے پھر بہت دکھ ہوا۔ جب گاؤں کے نوجوان اکھاڑے میں کشتی کی مشق کر رہے تھے اور وہ بھی ٹہلتا ہوا تماشہ دیکھنے پہنچ گیا تھا۔ مجمع میں سے کسی نے کہا کہ "بھئی ماسٹر جی کو بُلالو وہ بھی تو جوان ہیں!" اور ایک چھ فٹ کا منحوس اپنا پاٹ جیسا سینہ نکال کر بولا کہ "ہونہہ ماسٹر کو جوانوں میں کس نے گنا؟ وہ بیچارہ تو جوانی کے نام کا داغ ہے!!" سارے بدن پر ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ رینگ آیا اور وہ جوتے گھسیٹتا پلٹ کر چلنے لگا تو اُس نے کلو چوکیدار کو کہتے سُنا "اللہ تعالیٰ اس مینر سانڈ سے شریفوں کی عزت آبرو بچائے رکھے ——"

وہ اپنے کوارٹر پہنچا تو اُس نے آئینہ میں اپنے سُوکھے ہوئے بازوؤں اور پچکے ہوئے رخساروں کو دیکھ کر سرد آہ بھری اور چادر اوڑھ کر پلنگ پر لیٹ گیا!! اس واقعہ کے بعد اُسے کلو چوکیدار سے کچھ عجیب سی وابستگی ہو گئی اور اس مینر سانڈ سے خائف رہنے لگا۔

اس کی زندگی میں جہاں ہنسی خوشی بیگانہ رہی محبت اور امید کا بھی کوئی گزر نہ ہوا تھا اُس کی ماں تو اُسے دودھ پیتا ہی چھوڑ مری تھی پھر اُس نے ہوش سنبھال کر جو عورت دیکھی وہ سوتیلی ماں تھی —— اور اس کے اپنے حق میں ایسا عذاب تھی کہ اُسے عورتوں سے ہی نفرت ہو گئی۔ ایک عورت جس کی کوکھ سے وہ پیدا ہوا اس کے لئے سوتیلی ماں کا جہنم چھوڑ گئی۔ اسے مرتے وقت اپنے معصوم بچے پر بھی رحم نہیں آیا۔ اس نے نزع کے عالم میں اپنے بچے کا گلا گھونٹ کر اُسے دنیا کے دُکھوں سے نہیں بچایا کتنی بے رحم تھی وہ بھی! اور پھر جو ماں کے نام سے زندہ رہی اس نے وہ سلوک کیا کہ وہ اب عورت کو محض ناگن سمجھتا تھا اور بس!!

یوں تو کبھی کبھی اُسے اپنے آپ سے گھن آتی کہ وہ دنیا کے انہیں دھوکے باز انسانوں میں سے ایک ہے جنہوں نے اسکی وزنی لاش اُسی کے کمزور شانوں پر لاد دی تھی اور اُس کا دل چاہتا کہ وہ کسی دن چُپ چاپ اپنا گلا گھونٹ کر یہ گندہ اور ناکارہ بوجھ

دوبارہ پٹخ دے اور کہیں آسمان کی بلندیوں پر سے جھانک کر اُن لوگوں کی حالت پر قہقہے لگائے جو اُس کے جنازے کو بہ امر مجبوری اپنے کندھوں پر دھر کے قبرستان تک جائیں گے اور اس کی بے حس وحرکت ٹھہری ہوئی لاش کو ترحمانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اظہارِ افسوس کر کے ایک دوسرے کو دھوکا دیں گے اور انہیں ذرا بھی احساس نہ ہوگا کہ یہ تو انتقام تھا تمہارے خلاف اور انسانیت کے خلاف اور اُن واقعات کے خلاف جنہوں نے اُسے بچپن سے پستے ہی رہنا سکھایا تھا، کُھلنا نہیں!

پھر ایک دن جب وہ خوش وخرم زندہ دل لوگوں کے ہجوم میں اپنے ناتواں جسم کو بے بس پاکر جانے کس طرح ایک ہی ریلے میں مردانی ڈیوڑھی سے لیکر زنانے دروازے تک بہتا چلا گیا تو دفعتاً کسی نے مہندی لگے ہاتھوں کی رنگ برنگی چوڑیاں چھنکار کر چق کے پیچھے سے ہی وہ بھاری اور اَن دیکھا بوجھ اُس کے کاندھوں سے اٹھالیا جس نے اُسے جوانی کے نام کا داغ بنا رکھا تھا ——— اور یکایک اس نے اپنی کمر میں چند لمحوں کے لئے کمان کا جھکاؤ نہیں تیر کا تناؤ محسوس کیا۔

امام صاحب کے یہاں محفل میلاد تھی، وہ بھی اور لوگوں کے ساتھ آنگن میں داخل ہوا اور پھر اچھی نشست اور میلاد خواں مولانا کی قربت کے لئے افراتفری مچی تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھکے کھا کر بالکل وہاں پہنچ گیا جہاں کہ چق کے پیچھے رنگین سائے لرز رہے تھے، وہ سہم کر وہیں سمٹ گیا "یہ میں کہاں آگیا؟"

جنہیں وہ نہیں جانتا تھا خود بھی اُن لوگوں کے لئے اجنبی تھا کسی نے دبے لہجے میں سرگوشی کی "یہ کون ہیں قادر؟ پہچانے نہیں پڑتے۔"

"یہی تو ہمارے ماسٹر جی ہیں آپا"، آپ نے پہلے نہیں دیکھا۔

مولانا کی گونجدار آواز کہیں گہرے غار میں چلی گئی، اردگرد بیٹھے ہوئے متحرک لوگ ساکت دھبے بن گئے اور سر پر تنا ہوا لمبا چوڑا شامیانہ گیس کی لالٹینوں سمیت فضا میں تحلیل ہو گیا۔ پیروں کے نیچے سے زمین اور دھاریوں والی دری دونوں ہی نکل بھاگیں وہ ہوا میں معلق ٹنگا ہوا تھا! یکہ وتنہا!

جب کچھ کچھ ہوش پلٹے تو اس نے سُنا "دیکھنے میں تو شریف لگتے ہیں۔۔۔۔"

پھر سے ماحول نے قلابازی کھائی، مولانا اپنی تمام تر کڑک اور گونج لے کر صرف اس سے مخاطب ہو گئے، سامعین ایک دوسرے سے بے نیاز ہو کر اس کی طرف بڑھے تو اور باری باری اُسے گلے لگانے لگے۔ شامیانے میں ٹنگی ہوئی گیس کی لالٹینیں لٹک کر اس کے آس پاس آگئیں اور سب ایک ساتھ بھڑک کر جلنے لگیں، دری پر آپ ہی آپ سے ایرانی قالینوں والا نرم رواں اُگ کر اُس کے تلووں کو گدگدانے لگا۔

"قادر کی آپا ——— امام صاحب کی لڑکی ——— شاداں بیگم"

وہ پورے وقت بھی وظیفہ زیرِلب گنگناتا رہا اور محفل کے اختتام پر لاکھ دھکاپیل کے باوجود اُس کی چال کا ٹھہراؤ اور وقار نہ جا سکا۔

"ضرور یہی وہ لڑکی ہے" ایک دن قادر اس کے کوارٹر پر آیا تھا اور ایک تکیہ کا غلاف دکھا کر کہنے لگا کہ اس پر انگریزی میں موٹے قلم سے "شاداں بیگم" لکھ دیجئے۔

"اُس نے تعجب سے پوچھا "کیا مطلب"؟ شاداں بیگم، کون ہے؟ اور میں غلاف پر کیوں لکھوں؟" قادر نے بتایا "ہماری آپا کا یہی نام ہے، ان کو انگریزی نہیں آتی ہے آپ لکھ دیں گے تو وہ ریشم سے کاڑھ لیں گی۔ اُس نے نہایت بے دلی سے قلم اٹھا کر غلاف پر "شاداں بیگم" لکھ دیا ___ اور اب سوچ رہا تھا کہ ناحق میں نے بلا ٹالی مجھے خوشخطی سے لکھنا چاہیئے تھا۔ "بھئی جو ہمیں شریف سمجھے گا ہم تو اس کے ساتھ شرافت ہی برتیں گے۔"

دوسرے دن اسکول ختم ہوا تو اس نے جاتے ہوئے قادر کو روک کر کھڑکیوں کے شیشے صاف کرنے کا حکم دیا۔ "جانے بیچارے قادر کو کس خطا کی سزا مل رہی ہے۔" بچے یہ سوچتے ہوئے ایک ایک کرکے چلے گئے تو اُس نے رُکتے ہوئے الفاظ میں قادر سے کل والی بات پوچھی

"قادر، جب کل تمہارے یہاں میلاد تھا تو میری بات تم سے کون پوچھ رہا تھا؟"

قادر جھاڑن سے کھڑکیوں کے شیشے پونچھتے پونچھتے رُک گیا اس نے بڑے تعجب سے ماسٹر جی کی طرف دیکھا اور پھر ذہن پر زور ڈالکر سوچنے لگا۔ "کل تو ___ میلاد میں تو ___ کسی نے بھی کچھ نہیں کہا تھا ماسٹر جی ___ آپ کے بارے میں تو ___"

اس کا دل اندر کو دھنسنے لگا۔ "واہ میں تو سن رہا تھا جب تم بڑے سے خاصدان میں اندر سے پان بنوا کر لائے تھے اُس سے پہلے، تو ہاں چق کے نیچے ___ قادر کو ایکدم یاد آگیا اور وہ ہنسنے لگا ___ ماسٹر جی نے ٹھٹک کر اُس کی طرف دیکھا "اچھا وہ ___ ہماری آپا پوچھ رہی تھیں، اُنھوں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا ___ انہوں نے آپ کو سلام بھی کہا تھا اور کہہ رہی تھیں کہ جواباً کہدیں تو میں بھی تمہارے ماسٹر جی سے انگریزی پڑھوں"۔

ماسٹر جی کو ٹھنڈا پسینہ آگیا اور کھڑکیوں کے شیشے پہلے سے بھی زیادہ دھندلے نظر آنے لگے۔

"تو پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے؟ میں کیا کہتا" قادر جلدی سے کام نپٹا کر بھاگ گیا۔

"مجھے سلام کہلوایا ہے اور کہہ رہی تھیں کہ جواباً کہدیں تو ___" بڈھے رحمو نے کئی بار تعجب سے دیکھا کہ ماسٹر جی کو اپنے آپ سے باتیں کرنے کا نیا عارضہ ہو چلا ہے!

پھر اس خزاں رسیدہ درخت میں بھی سرسبز شاخیں پھوٹیں۔ یہ ریتیلا نشیب بھی جلترنگ بجانے لگا اور ماسٹر جی نے پہلی بار بیتے دنوں کی چڑھی ہوئی گرد جھاڑی تو انہیں اپنے جوان سینے میں ارمانوں بھرے دل کی دھڑکنیں سنائی دیں۔

یہ جھینپا کم گو اور مخبوط الحواس سا انسان اب شور و شغب میں بڑی دلچسپی لینے لگا کترا کے راہ چلنے والا اب سڑک پر گزرتے لوگوں کو روک روک کر اُن سے گپیں ہانکتا، کلو چوکیدار کو اب مسکراہٹ کا ہدیہ زیادہ گرمجوشی سے عطا ہوتا اور رحمو کو بھی رات گئے بستر میں فلمی گیتوں کی دُھنیں سنائی دیا کرتیں۔

پچھلی عید پر ہی لوگوں نے ماسٹر جی کو سر جھکائے دوگانہ پڑھنے عیدگاہ جاتے دیکھا تھا اور یا اب اکثر و بیشتر وہ مسجد کی سیڑھیوں پر امام صاحب سے مسئلہ مسائل پر فیض کرتے ہوئے ملتے۔ جمعہ کی نماز تو اُن سے کبھی قضا نہ ہوتی — یہاں تک کہ ایک بار جب امام صاحب نے گاؤں کے دو چار نوجوانوں کو نماز روزے سے بے تعلق رہنے پر لتاڑا تو ماسٹر جی نے پاس کھڑے ہو کر خوب ہاں میں ہاں ملائی۔ ماسٹر جی کی باتوں میں اب خود اعتمادی کی وہ جھلک پائی جاتی تھی کہ منیر سانڈ بھی نظر نہ ملا سکا اور سچ مچ اُس نے کان پکڑ کر توبہ کرتے ہوئے امام صاحب کے علاوہ ماسٹر جی سے بھی وعدہ کیا کہ آئندہ سے وہ جمعہ کی نماز میں تو ضرور ہی شریک ہوا کریگا۔

ماسٹر جی قدم قدم پر جھومتے ہوئے گھر لوٹے تو سب سے پہلے انہوں نے اُن مقویات کی پڑیا سے رجوع کیا جس نے اُن کی رگ رگ میں یہ توانائی اور نس نس میں احساس خودی پیدا کیا تھا۔ ماسٹر جی نے بکس کھول کر کپڑوں کی سب سے آخری تہہ میں سے وہ رومال نکالے جن کے حاشیے بڑی نفاست سے ترپے ہوئے تھے اور کونوں پر ننھے ننھے گل بوٹے کڑھے ہوئے تھے، یہ رومال قادر نے اُس دردمری کے بدلے لاکر دئے تھے جو اب ان کا محبوب مشغلہ تھی اور وہ آئے دن کاربن پیپر سے میز پوشوں اور تکیہ کے غلافوں پر ڈرائنگ بُک کے مختلف پھول اُتارا کرتے تھے۔ اور شاداں نے سارا شکریہ جمع کرکے ان رومالوں کی صورت میں پیش کیا تھا۔

ماسٹر جی نے آج تک شاداں بیگم کی ذرا سی جھلک بھی نہ دیکھی تھی اور کبھی کسی کو اس کے بارے میں یہ کہتے بھی نہ سُنا تھا کہ وہ سبزی بیچنے والی کی طرح موٹی ہے یا پنواڑن کی طرح دُبلی، وہ رات کی طرح سیاہ ہے یا دن کی طرح اُجلی — اور پھر بھی ماسٹر جی کو سب معلوم تھا اور وہ اپنے علم پر مطمئن بھی تھے۔ ان کا یہ تصور اتنا اٹل اور گہرا تھا کہ خود شاداں بھی چاہتی تو نہ جھٹلا سکتی۔

انہوں نے اپنے خواب وخیال کے سہارے شاداں کو اس طرح دیکھ لیا تھا کہ اب اس کے مسکراتے ہونٹ چمکتی آنکھیں اور بکھرے بال ہر دم اُن کے حواس پر مسلط رہتے، اور انہیں اپنے خیال کی ہمہ گیری اپنے خوابوں کی سچائی اور اپنے تصورات کی گہرائی پر ناز ہو کے رہ گیا جب وہ شیخ جی کے یہاں سے ایک تشنہ ارمان لئے لوٹ رہے تھے۔

شیخ جی کی لڑکی کا عقد تھا انہوں نے ماسٹر جی کو بھی دعوتِ شرکت دی، اب ماسٹر جی اپنی صورت ولباس کی طرف سے ایسے لاپروا بھی نہ رہتے تھے اور وہ بغیر کسی دھکا پیل کے خود ہی کھنچے کھنچے بندھے اُن بانس کی جعفریوں تک پہنچ گئے جہاں کہ اُن کی توضیح کے مطابق "بیندی چمکی، چوڑی چھنکی، اور لہرایا آنچل —" تمام وقت ماسٹر جی کے کان اسی طرف لگے رہے کہ شاید اپنے بارے میں کوئی اظہار خیال! نہیں تو اپنا نام ہی سُن لیں، مگر وہاں تو ہر ایک کی بات پر کوئی اتنا کچھ کہہ رہا تھا کہ ماسٹر جی اپنی تخصیص نہ کر سکے، رسم نکاح کے بعد شیخ جی نے کھانے کے لئے بھی روکا مگر ماسٹر جی کو امتحان کی کاپیاں جلد سے جلد جانچ کے بورڈ کو نتائج کی اطلاع کرنی تھی اور کچھ ہی دن کی مہلت ملی تھی، وہ معذرت کرکے چل دئے۔ راستہ بھر ماسٹر جی یہی سوچتے جا رہے تھے کہ "شاداں" نے کم از کم مجھے بیٹھے دیکھ لیا ہوگا اور جانے کس شوق وتمنا سے دیکھا ہوگا۔ وہ بیچاری کہتی بھی کیا، کون سا اُس کا اپنا گھر تھا۔ اور اپنا گھر بھی ہوتا تو اب کہاں زبان سے کچھ نکلتا ہے جانے خیال ہی کیا کچھ ستم نہ ڈھاتا ہوگا۔۔۔

ایسی ہی اوندھی سیدھی باتیں سوچتے وہ ایک گلی کے نُکڑ پر پہنچے تو اُن کے جوتوں کی سہمی ہوئی چاپ کے ساتھ ہی

ایک ٹھنکتا سایہ لپکا۔۔ "افوہ!!" جانے کیسے! کیوں! کس کے حکم سے ماسٹر جی کی دو انگلیاں ہاتھ میں پکڑی ہوئی ننھی منی ٹورچ پر جم گئیں۔ اور روشنی کا مختصر سا ہالہ بڑھ کر سرخ دوپٹہ کے سفید گوٹے سے گلے مل گیا۔ مہندی لگے ہاتھوں کی چوڑیاں لرز کر چھنکیں اور تیزی سے نکڑ پر مڑتی ہوئی لڑکی کا پیچھا ماسٹر جی کی آواز نے کیا "شاداں" وہ یکبارگی چیخ ہی تو پڑے۔۔۔۔۔ جب ان کی آواز پلٹ کر اُن کے اپنے کانوں سے ٹکرائی تو انہوں نے بوکھلا کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹورچ کو مسل ڈالا۔" یہ میں نے کیا کیا۔۔۔۔۔ ایک اَن دیکھی صورت کو میں نے شاداں کہکر پکارا ہے اور اب یہ گلی میں دوڑ کر جانے والی لڑکی اسی تیزی سے دوڑتی ہوئی شیخ جی کے گھر تک جائیگی اور وہاں عورتوں کی بھری محفل میں کہیگی کہ جانے یہ شرمیلی بتو شاداں بیگم گلیوں میں اندھیرے اُجالے کس کس سے ملتی ہیں آج تو ان کا کوئی ملاقاتی مجھ پر دھوکا کھا کے حلق کی تمام قوت سے "شاداں" پکار اٹھا۔" شاداں یہ سنکر کانپ جائیگی، وہ کہیگی۔۔۔۔

اور تبھی نکڑ کے موڑ پر چھپی ہوئی لڑکی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جی ماسٹر جی!"

ماسٹر جی کا دل نہ پہلو سے ڈوب کر قدموں میں پہنچا نہ اُچھل کر حلق میں اٹکا بلکہ سینے سے نکل کر کانوں میں آگیا۔۔۔۔ "جی ماسٹر جی" کے بعد نہ شیخ جی کے گھر بجنے والی شہنائیاں سنائی دیں نہ آس پاس کی گلیوں میں بھونکنے والے کتوں کی آوازیں! بس دھک دھک ہو رہی تھی اور اس طبلے کی تھاپ پر سارا جہاں دیوانہ وار ناچنے لگا۔۔۔۔

"شاداں۔۔۔۔ شاداں۔۔۔۔ شاداں۔۔۔۔"

"فرمایئے ماسٹر جی!"

"تم یہاں۔۔۔۔" کیا میری منتظر تھیں؟ ماسٹر جی نے پوچھنا چاہا۔

"جی میں۔۔۔۔" وہ لمحہ بھر چپ رہی اور پھر کچھ آگے کو بڑھ آئی۔ "میں قادر کی راہ تک رہی تھی۔۔۔۔ وہ بڑا بدمعاش ہے!۔۔"

"قادر کی راہ۔۔۔۔" ماسٹر جی نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دُہرایا۔

"میں نے کہا تھا کہ چراغ جلتے ہی مجھے آکر لے جانا، شیخ جی کے یہاں سب چلے گئے اور میں دوپٹہ میں گوٹا ٹانکتی رہ گئی۔ وہ ابھی تک نہیں پلٹا کہیں کھیل میں لگ گیا ہوگا۔"

ماسٹر جی خشک ہونٹوں پر زبان پھر کے ہکلائے۔ "چلو میں تم کو شیخ جی کے یہاں پہنچا دوں!"

"آپ ماسٹر جی!" وہ پھر دیوار کے پیچھے کو سمٹ گئی۔

"کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" جیسے سال بھر کی محنت ممتحن کے آگے مارک لگانے کو ڈالدی ہو۔

"مجھے کیا اعتراض ہوتا۔۔۔۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔

"تو پھر؟" ماسٹر جی دو قدم بڑھ کر مقابل آگئے۔۔۔۔

اُس نے دوپٹہ کا پلہ چہرے پر کھینچتے ہوئے کہا۔ "آپ کیا جانیں ماسٹر جی، یہاں کے لوگ بہت خراب ہیں۔۔۔ بے بات کی بات بنتی ہے۔۔۔۔ کہیں خواہ مخواہ کوئی جھوٹے سچے۔۔۔۔" اس ڈر میں کتنی لذت اس خوف میں کس قدر کیف تھا اور کتنا دلکش تھا

بجرہ۔۔۔۔۔۔یوں اندھیری گلی میں دو دلوں کا ہم آہنگ ہو کر دھڑکنا ہربار گوٹے کی چمک کے ساتھ چوڑیوں کا بج اُٹھنا اور مشتاق نگاہوں کا کانپتے لبوں کی سنگت میں کچھ کہتے کہتے ٹھہر جانا۔۔۔۔ دیکھئے کوئی ہمیں دیکھ نہ لے آج کی رات۔۔۔،

"میں جاتی ہوں، وہ دفعتہً مڑکر چلدی۔۔۔۔۔ اور وہ بے چینی سے ٹورچ کو ہاتھوں میں مسلتا گیا"

دوسرے دن جب ماسٹر جی سے قادر کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے پہلا سوال یہی کیا "تم کل شام کہاں چھپ گئے تھے حضرت!" اور قادر کی حیران آنکھوں سے بچ کر بولے "میں نے شیخ جی کے یہاں تم کو نہیں دیکھا" اکثر وہ اسکول میں کہہ اُٹھتے "یہ قادر بہت بدمعاش ہے۔ ۔۔۔۔ قادر بہت کھیل کود کا شوقین ہے" اور قادر کو یہ دیکھ کر کچھ اطمینان ہو جاتا کہ ان فقروں کے ساتھ ماسٹر جی کی آنکھوں میں غصہ تو نہیں البتہ اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ضرور ہوتی۔۔۔۔۔

ایک دن بہت غور و فکر کے بعد ماسٹر جی نے اپنے آپ کو اَن گنت گالیاں دے ڈالیں۔ میں نیند سے تو جاگ گیا مگر آنکھیں ہنوز بند کر رکھی ہیں۔ مجھے جلد ہی امام صاحب سے مل لینا چاہیئے جانے شاداں جی میں کیا سوچتی ہو گی کہ عجب بزدل انسان ہے۔ اُس دن گلی میں بیوقوفوں کی طرح چپ کھڑا رہا اور اب جاکر بالکل ہی مرگیا۔

جس دن ماسٹر جی اظہارِ مدعا کے لئے بمشکل سے درست ہو کر چلے تو کواٹر سے نکلتے ہی امام صاحب سے ٹکر ہو گئی، وہ خود ماسٹر جی سے ملنے آرہے تھے۔ "جذبۂ دل جو سلامت ہے تو انشاءاللہ" ماسٹر جی بڑے احترام سے انہیں اپنے کمرے میں لے آئے "میں تو خود ہی حاضر خدمت ہو رہا تھا"

"مجھے تم سے ایک ضروری معاملہ میں گفت و شنید کرنا تھی تو میں نے سوچا کہ چلو مل ہی آؤں۔۔۔۔"

"بڑی تکلیف فرمائی۔۔۔۔۔ بڑی عزت افزائی ہے" ماسٹر جی نے رحمو کو آواز دے کر چائے بنانے کو کہا۔

"تکلف نہ کرو بیٹا۔۔۔۔۔ میں تو اپنی ہی غرض لے کر آیا ہوں" امام صاحب نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"اولاد کی خاطر انسان کو تکلیف بھی ہو تو راحت سمجھ کر برداشت کرتا ہے۔۔"

تو وہ خود ہی مجھکو پسند کرتے ہیں۔۔۔۔۔ یا پھر شاداں نے اُن سے کہدیا۔۔۔۔ یا کسی نے اُس دن گلی میں باتیں کرتے دیکھ لیا اور امام صاحب۔۔۔،

امام صاحب کھنکارے "میاں تم نے دلّی کے کسی کالج میں تعلیم پائی ہے نا؟"

ماسٹر جی کا حلق ایکدم خشک ہو گیا۔۔ کالج میں! "جی وہ۔۔۔ کالج میں تو نہیں البتہ ہائی اسکول تک پڑھا ہوں پھر والد کے انتقال کے سبب۔۔۔۔"

خیر خیر اس سے کیا ہوتا ہے بہر حال۔۔۔۔

ماسٹر جی کی جان میں جان آئی۔ "جی ہاں جی ہاں۔۔۔ فرمایئے۔۔"

"تو میرا مطلب تھا کہ وہاں کالج اسکول کے سبھی لوگوں سے تمہاری جان پہچان ہو گی۔"

"جی ہاں، جی ہاں، سب کو جانتا ہوں، پرنسپل صاحب سے والد کی انتہائی گہری دوستی اور..." امام صاحب نے بات کاٹی

"تم کسی لڑکے نورالزماں کو بھی جانتے ہو؟"

"جی!؟" ماسٹر جی نے ایکدم ہڑبڑا کر پوچھا۔

"نورالزماں میرے سالے کا اکلوتا بیٹا ہے ماشاء اللہ بہت ذہین ہونہار بچہ ہے، امسال اس نے دلّی کے کسی کالج سے بی، اے پاس کیا ہے، میں نے سوچا کہ شاید تم اُسے جانتے ہو اور اُس کے عادت اطوار کے بارے میں کچھ بتا سکو... یہ معاملہ چھان بین کے بغیر نہیں چلتا، یوں تو بچہ ہمارے گھر کا ہے بچپن میں یہاں بہت رہا ہے اور تب ہی ہماری سلیچ نے عزیزہ شاداں بیگم کے لئے اُس کا رشتہ پیش کیا تھا... خیر وہ بہت زمانے کی بات ہے بچی بھی کمسن تھی اب وہ لوگ شادی کی جلدی کر رہے ہیں اور مجھکو علم نہیں کہ صاحبزادے...

اس کا ذہن ایک ساتھ جھوٹ بولنے پر آمادہ ہو گیا" ارے آپ نورالزماں کی بات پوچھتے ہیں؟ امام صاحب بچی کو کنوئیں میں نہ دھکیلئے گا وہ نورالزماں کالج کا سب سے لوفر لفنگا!! کئی بار ان ہی حرکتوں پر نکالدیا گیا تھا۔ وہ تو بڑا ہی آوارہ اور اوباش طبع ہے یوں سمجھ لیجئے کہ یہاں کے منیر سانڈ سے بھی دو جوتی زیادہ..." مگر اس نے رک رک کر مدھم آواز میں کہا" مجھے افسوس ہے امام صاحب میں کسی نورالزماں لڑکے سے واقف نہیں ہوں۔"

"خیر خیر کوئی حرج نہیں... وہ تو میں نے سوچا کہ بر سبیل راہ ہے تم سے پوچھ لوں ورنہ گھر کا بچہ ہے اور ہر ایک سے اُس کی تعریف ہی سُنی ہے..... اللہ نے چاہا تو بچی سُکھی رہے گی..."

امام صاحب چائے پی کر داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تشریف لے گئے... ماسٹر جی نے بکس کھول کر کپڑوں کی آخری تہ میں سے گل بوٹوں والے رومال نکالے اور وہیں اسٹول پر بیٹھے بیٹھے گھٹنوں پر سر رکھ کر سب کو آنسوؤں سے تر کر ڈالا۔

اور اس کے بعد پندرہ دن تک ماسٹر جی گوشہ نشیں رہے اول کسی تہوار کے سلسلے میں تین چار دن کی چھٹیاں نکل آئیں اور پھر جو ماسٹر جی کو بخار چڑھا ہے تو انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ اس بخار کی وجہ ماسٹر جی کی حد تک کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر رحمو اور کلو چوکیدار کو پتہ تھا کہ چلّے کے جاڑوں میں ساری ساری رات برگد کے تلے اوس میں پڑے رہنا بھی رنگ لاتا ہے..... قیامت کی سردی اور برگد کا سایہ!! یہی کیا کم خدا کا فضل ہے جو بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے ورنہ یہیں پردیس کی مٹی ہوتی!

پندرہ دن میں ادھر ماسٹر جی کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی اُدھر امام صاحب کا پکا مکان سفید قلعی سے جگمگا اُٹھا۔ محلے کی شریر چھوکریاں رات کو ڈھولک بجا کر سہاگ بھی گانے لگیں اور شہر کے چھاپے خانے میں دن تاریخ کے رقعے بھی چھپنے چلے گئے۔

امام صاحب نے مزاج پُرسی کے لئے قادر کو ماسٹر جی کے کوارٹر پر بھیجا تو کوشش کے باوجود ماسٹر جی ضبط نہ کر سکے اور ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد انہوں نے پوچھ ہی لیا۔" تمہاری آپا کا بیاہ کب ہو رہا ہے قادر؟ وہ تو بہت خوش ہوں گی!"

"شروع چاند کی تاریخوں میں ہوگا ماسٹر جی آپا تو ذرا بھی خوش نہیں ہیں وہ تو ایکدم آپکی طرح دُبلی ہو گئی ہیں اور اتنا روتی ہیں کہ بس ہر دم آنکھیں لال رہتی ہیں، کھانا بھی ٹھیک نہیں کھاتیں!"

"کیوں؟" وہ سب سمجھتے ہوئے بھی اُچھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔ "کچھ کہتی ہیں کیا؟"

"کچھ نہیں کہتیں۔" قادر کھسیانی سی ہنسی ہنس پڑا۔ "شادی پر سب ہی لڑکیاں روتی ہیں، مگر آپا بہت روتی ہیں سب سے زیادہ!"

قادر چلنے لگا تو ماسٹر جی نے آواز دے کر اُسے دروازے پر سے لوٹا لیا اور پلنگ کی چادر پر نظریں جمائے دھیرے سے کہا "اپنی آپا سے میرا سلام کہنا، اور پوچھنا کہ اندر کوئی پھول نہیں بنوائیں گی وہ ۔۔۔ دیکھو اکیلے میں پوچھنا جب وہ رو نہ رہی ہوں۔"

قادر چلا گیا تو دیر تک ماسٹر جی سبک سبک کر روتے رہے۔

ماسٹر جی نے یونہی بلا مقصد ایک سوال کیا تھا مگر شاداں نے اس کا بڑا مستحکم بڑا ٹھوس اور جامع جواب دیا اس نے دوپٹہ کے پلّو سے رگڑ کر سُرخ آنکھیں خشک کیں اور پھر سرد آہ بھر کر کہا "ماسٹر جی سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اب میں جھوٹے پھول بنا کے کیا کروں گی اللہ سے دعا کیجئے کہ میں اپنے راستے کے کانٹے ہٹا کے پھول بو سکوں ۔۔۔"

ماسٹر جی نے رات بھر پیڑ کے کھُردرے تنے سے لپٹے ہوئے کسی کے نرم گرم تصور سے گفتگو کی تھی انہوں نے کہا تھا کہ کیا تم میری زندگی میں محض اس لئے آئی تھیں کہ مجھے میری ناکارہ جوانی کا احساس دلا کر واپس چلی جاؤ، محض یہ بتا کر کہ تم بھی کسی عورت کے خواب و خیال کی دنیا آباد کر سکتے ہو تم نے مجھے اس کا موقعہ کیوں نہ دیا کہ میں تمہارے سکھائے ہوئے گیت تمہارے قدموں میں بیٹھ کر گا سکوں، تمہارا دیا ہوا ساز بجا کر تمہیں کو سنا سکوں۔"

قادر کے منہ سے شاداں کا جواب سُن کر ماسٹر جی اپنی تصوراتی دیوی کے آگے دوزانو ہو گئے۔ "تم کتنی بہادر ہو ۔۔۔ تم نے ہمت نہیں ہاری ۔۔۔ تمہیں ابھی کوئی اُمید باقی ہے شاید!" اور اسی انجان امید کی تکمیل کے لئے ماسٹر جی اس وقت تک چشم براہ رہے جب تک آتشبازیاں نہ چلیں شہنائیاں نہ بجیں اور بڑی شان کے ساتھ گھوڑے پر ڈٹا ہوا خوبصورت دولہا امام صاحب کے دروازے پر نہ آپہنچا۔

دیوانوں کی طرح چہل پہل کو گھورنے والے ماسٹر جی نے قادر کو اپنے پاس حیران سا کھڑا دیکھا۔ "میں نے آج صبح آپا کو بتایا تھا کہ میں دوسری جماعت میں پاس ہو گیا تو انہوں نے کہا کہ میرا امتحان بھی آپہنچا ہے دعا کرو میں بھی کامیاب ہو جاؤں۔"

ماسٹر جی کے دماغ سے خودکشی کی ساری ترکیبیں نکل بھاگیں وہ کسی نامعلوم امتحان کی کامیابی کے لئے دعا مانگنے لگے ۔۔۔ جس انسان کی زندگی میں عورت زہرِ قاتل تھی آج وہ ایک عورت کے مبہم سے اشارے پر زندگی کا سر اتھام کر آنے والے وقت کا منتظر ہو گیا اور وقت تیز رفتار آندھی کی طرح بڑھا چلا آرہا تھا۔

جب مجمع میں سے کچھ معزز حضرات اُٹھ کر زنانے میں چلے گئے اور قاضی جی اگالدان میں پان تھوک کر گلا صاف کرنے لگے تو جیسے گوٹا لگے سُرخ دوپٹہ کا آنچل تھامے ہوئے شاداں نے ماسٹر جی کے پاس آ کر کہا "شرم نہیں آتی تم اس طرح چھپ کر بیٹھے ہو اور مجھ سے جواب طلب ہو رہا ہے۔" مگر یہ صرف ماسٹر جی کا خیال تھا، شاداں کو جواب میں وقت پیش نہیں آئی اور کچھ ہی دیر میں جو لوگ

لڑکی سے اجازت لینے گئے تھے وہ بدحواس چہرے بنائے گرتے پڑتے قدموں سے پلٹ آئے۔ دھیمی دھیمی اور تیز تیز باتوں کا طوفان اُبل پڑا، قاضی جی لاحول پڑھتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ "نکاح نہیں ہو سکتا۔"

اور شیخ جی دھاڑے "اللہ ایسی اولاد سے محروم رکھے تو اچھا ہے۔۔۔۔۔ لعنت ہے خدا کی۔" ماسٹر جی نے چور نظروں سے پاس بیٹھے ہوئے کلو چوکیدار کی طرف دیکھا اور کلو چوکیدار نے بڑھ کر جاتے ہوئے شیخ جی کو پکڑ کہا "بات کیا ہے شیخ جی؟"

"اللہ توبہ، اللہ توبہ۔۔۔ ناک کٹ گئی امام صاحب کی۔۔۔"

"واقعہ کیا ہے آخر؟" اس نے ملزمانہ انداز سے کلو چوکیدار کی آڑلی جیسے اُسے ڈر ہو کہ حادثہ کے ساتھ ہی ہر ایک بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہوگا۔۔۔

"میاں واقعہ کیا ہوتا صاحبزادی نے صاف انکار کر دیا کہ نکاح کے لئے میری رضا نہیں ہے!"

"کیوں شیخ جی یہ کیا قہر ہوا۔۔۔۔؟" کلو چوکیدار نے اپنی زندگی میں ایسی بات نہ سُنی تھی۔

"کیا کہوں بھائی، کیا کہوں" شیخ جی نے اپنی دستار سنبھالی۔ "لڑکی کہتی ہے کہ۔۔۔۔"

"کیا کہتی ہے؟" ماسٹر جی پر سر سے پیر تک رعشہ طاری تھا۔

"کہتی ہے کہ میں نکاح کرونگی تو منیر سے۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔"

"نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ یہ کبھی نہیں۔۔۔۔"

کلو چوکیدار نے لپک کر چیختے ہوئے ماسٹر جی کی بانہہ پکڑ لی "آپ کیوں جھگڑے میں پڑتے ہیں" مگر وہ دیوانوں کی طرح چیخ رہے تھے "مجھے چھوڑ دو مجھے جانے دو، یہ غلط ہے، ایسا نہیں ہو سکتا" کلو چوکیدار نے گھسیٹ کر انہیں مجمع سے علٰحدہ کر دیا "آپ نہیں جانتے ماسٹر جی، یہ بیسویں صدی ہے اب لڑکیوں میں پہلی سی حیا شرم نہیں ہے، ہم نے بھی لڑکی ذات کو بولتے نہیں سنا تھا مگر اب دنیا میں کیا ہونے سے رہ گیا ہے۔۔"

شامیانہ میں امام صاحب اور دولہا والوں کے درمیان شور محشر بپا تھا۔۔۔۔ ذرا فاصلہ پر اندھیرے میں کلو چوکیدار کے شانے پر سر رکھے ماسٹر جی سُبک رہے تھے، نہیں نہیں مگر یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔"

شریف عنایت اللہ

ویرانے میں ایک عورت

افراد :-

امر

میرا ـــــ اور مہندر۔

[آبادی سے دور پہاڑی علاقے میں ایک ویران سا غار ـــــ غار کا دہانہ کانٹے دار جھاڑیوں کے دروازہ سے بند ہے۔ غار کے اندر ایک غلیظ سی چارپائی ہے۔ اس سے قریب انگیٹھی میں آگ سلگ رہی ہے۔ دروازہ سے قریب ایک گرد آلودہ میز اور دو کرسیاں ہیں۔ میز پر چند انگریزی اور اُردو کی کتابیں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی ہیں۔ اِس وقت شام کے چھ بجا چاہتے ہیں۔ بارش اور طوفان کے آثار ہیں۔ غار میں دھندلی سی روشنی ہے لیکن انگیٹھی میں دہکتی ہوئی آگ چراغ کا کام دے رہی ہے۔ میز پر خالی بوتل کے منہ میں ایک آدھی جلی موم بتی لگی ہوئی ہے۔ میز کے مقابل کرسی پر ایک شخص بیٹھا روٹی پر مکھن لگا رہا ہے۔ غار کی دوسری چیزوں کی طرح اس کے کپڑے گرد آلودہ ہیں۔ اس کے سر کے بال بڑھے ہوئے ہیں۔ چہرہ کو گھنی داڑھی اور مونچھوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس کی عمر ۳۵ سال سے زیادہ نہیں لیکن اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ صحرا نوردی نے اُسے معمر بنا دیا ہے۔ اس کے مقابل ایک قبول صورت نوجوان بیٹھا ایک موٹی سی کتاب کی ورق گردانی کر رہا ہے]

پہلا مرد :- (روٹی چباتے ہوئے) تم میری پسند کی چیز نہیں لائے مہندر ؟

مہندر :- معاف کرنا امر بھیا ـــــ ان دنوں آپ کی صحت اچھی نہیں ہے۔ میرے خیال میں شراب آپ کے لئے مضر ثابت ہو گی۔

امر :- مضر ثابت ہو گی (ہنستا ہے) پاگلوں جیسی باتیں نہ کرو مہندر۔ اگر مجھے شراب نہ ملے تو میں اس ویرانے کی سسکتی خاموشیوں میں سردی سے ٹھٹھر کر مر جاؤں۔ میرے تفکرات مجھے ایک ہفتہ کے اندر بستر مرگ پر لٹا دیں ـــــ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے مہندر !!

(مہندر موم بتی جلاتا ہے اور تھیلے میں سے شراب کی بوتل نکالتا ہے ـــــ امر کی نظریں بوتل پر پڑتی ہیں تو وہ قہقہہ لگاتا ہے)

امر :- خوب ـــــ !! ـــــ تو تم مجھے بنا رہے تھے مہندر ؟ ـــــ لاؤ مجھے دو بوتل۔

(وہ مہندر کے ہاتھ سے بوتل لے لیتا ہے۔ کاگ کھول کر گلاس میں شراب انڈیلتا ہے اور ایک ہی سانس میں پی لیتا ہے)

مہندر :- آپ نے آج معمول سے زیادہ پی لی ہے بھیا !!!

امر :- ارے نہیں مہندر۔ میں ہر بات میں اعتدال برتتا ہوں۔ آج پانچ دنوں سے میں نے کچھ نہیں پی تھی۔ میرے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ دل و دماغ پر ایک جمود سا چھا گیا تھا لیکن اب میں کچھ سکون محسوس کر رہا ہوں (وہ ٹہلنے لگتا ہے) یہ سامنے کا دروازہ کھول دو مہندر

آج پر نمائش ہے نا!! (مہندر دروازہ کھول دیتا ہے۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا آتا ہے اور موم بتی گل ہو جاتی ہے)

امر:۔ اِن کمبخت بادلوں کو بھی آج ہی آنا تھا شاید ——— (وہ آسمان کی طرف دیکھتا ہے) مجھے تو طوفان کے آثار نظر آتے ہیں ——— (وقفہ) ——— تم ابھی کچھ دیر پہلے سیاحوں کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے مہندر ——— کون ہیں یہ لوگ؟

مہندر:۔ مجھے تو رئیس زادے معلوم ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے اسی پہاڑی کے نیچے کیمپ لگایا ہے۔

امر:۔ کہیں وہ بھٹکتے ہوئے ادھر نہ چلے آئیں مہندر ——— ان کمبخت سیاحوں کا کیا ٹھکانا۔

مہندر:۔ لیکن بھیا ——— میں پوچھتا ہوں آخر آپ کب تک یوں بزدلی کی سی زندگی بسر کرتے رہیں گے؟ کب تک خود کو دنیا کی نظروں سے محفوظ رکھ سکیں گے؟ اِس ویرانے میں آپ نے اپنی زندگی کے چھ قیمتی سال ضائع کر دئے آپ اس ویرانے سے باہر آکر بہادروں کی طرح حقیقت کا مقابلہ کیوں نہیں کرتے بھیا؟

امر:۔ (دھیمے لہجے میں) میں اِس ویرانہ سے باہر کیسے آسکتا ہوں مہندر، میں ایک خونی ہوں۔ فوج کا ایک مفرور سپاہی ہوں۔ اگر ملٹری پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا تو پھر سوچو میں زندہ بچ سکونگا؟ میں نے ایک انگریز افسر کا خون کیا ہے، یہ کوئی معمولی جرم نہیں۔

مہندر:۔ یہ فراریت کا جذبہ آپ کو کہیں کا نہ رکھیگا بھیا ——— اور مجھے یقین ہے کہ آزاد ہندوستان میں بزدلوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

امر:۔ (غصّہ سے) تو مجھے بزدل کہہ رہا ہے مہندر؟ ——— مجھے ——— جس نے تبرق کے مورچہ پر گولیوں کی بوچھار کی پرواہ کئے بغیر دشمن کو مار بھگایا تھا جو آج بھی تن تنہا کھڑے کھڑے شیر اور چیتے کا شکار کیا کرتا ہے ——— (یکایک رُک کر ——— دھیمے لہجے میں) میں موت سے نہیں ڈرتا مہندر۔ لیکن اگر انگریزوں نے مجھے گرفتار کر لیا تو ذرا سوچو میرا کیا حشر ہوگا۔ میری پچھلی تمام خدمتیں بھلا دی جائیں گی، انھیں صرف یہ یاد رہیگا کہ میں نے ایک انگریز کا خون کیا ہے۔ اس خون کے پس منظر ایک کمزور عورت کی عصمت، اسکی خاک میں ملی ہوئی عزت و آبرو سب کچھ بھلادی جائیگی اور مجھے سزائے موت دیجائیگی ——— ذرا غور تو کرو مہندر، میرے لئے کیا یہ کتّوں کی سی موت نہ ہوگی؟

مہندر:۔ اِس ذلیل زندگی سے تو موت بہتر ہے بھیا ——— اور پھر آپ سے یہ کس نے کہدیا کہ آپ خونی ہیں؟ جنگ میں آپ نے اور آپکے ساتھیوں نے بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا، کس قصور پر؟ ——— صرف اِس لئے نا کہ دو حکومتوں کے وحشی قائدین نے ایک دوسرے کے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا تھا۔ آپ نے اُس انگریز کا خون نہیں کیا تھا بلکہ اُسے ایک بیکس ہندوستانی عورت کی عصمت لوٹ لینے کی سزا دی تھی جب انجان دشمن کو موت کے گھاٹ اُتارنا خون نہیں کہلایا تو پھر اسے خون کیسے کہا جاسکتا ہے؟ ایک فنکار کی زبان سے ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں بھیا۔

امر:۔ تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں مہندر۔ میں کسی زمانے میں فنکار ضرور تھا۔ میرا کام حسین چیزوں کی تخلیق ضرور تھا لیکن اب مجھ میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں مہندر۔ تعمیر کا مادّہ اب مجھ میں مردہ ہو چکا ہے۔ ایک زمانہ تھا، دوسری حسین چیزوں کی طرح مجھے ہرے بھرے شاداب درختوں پر چہچہاتی ہوئیں چڑیاں بیحد پسند تھیں، لیکن اب مجھے یہ کمزور پرندے نظر آتے ہیں تو اُن کے خلاف میرے دل و دماغ میں نفرت کا جذبہ موجیں مارنے لگتا ہے اور میری رائفل کی ایک ہی گولی انہیں نیست و نابود کر دیتی ہے۔ تم نہیں جانتے مہندر!۔ اِن کمزور پرندوں کو

گولی مار کر مجھے خوشی ہوتی ہے، اُن کمزوروں کو جو صرف فریاد کرنا جانتے ہیں، بغاوت کرنا نہیں جانتے، اینٹ کا جواب پتھر سے دینا نہیں جانتے۔

مہندر:۔ (آہستہ سے) کیا کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ یہ آپ کا کتنا بڑا زوال ہے؟

امر:۔ یہ میرا زوال ہے مہندر؟ ایک زمانے تک میں نے حسین چیزوں کی پرستش کی تھی۔ میں نے ایک حسین عورت سے محبت کی تھی۔ اُس بے وفا نے اور تمہاری دنیا نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا جانتے ہی ہو نا؟

مہندر:۔ دنیا اور دنیا والوں کو گالیاں دینا فضول ہے بھیا —— اپنے زوال کے آپ خود ذمّہ دار ہیں۔

امر:۔ میں یہ نہیں جاننا چاہتا مہندر کہ آیا یہ میرا زوال ہے یا عروج۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے تمہاری دنیا سے نفرت ہے، عورت سے نفرت ہے۔ اس کے سایہ تک سے نفرت ہے۔ آج چھ برسوں سے میں نے کسی بھی عورت کی شکل نہیں دیکھی۔ پچھلے سال آبشار کے کنارے مجھے کسی منحوس عورت کے قہقہے سنائی دیے تھے۔ ایک لمحے کے لئے میں کانپ اُٹھا تھا لیکن جانتے ہو میں نے کیا کیا؟ میں نے فوراً اپنے دونوں کان بند کر لئے، اپنی آنکھیں بند کر لیں اور میں درختوں کے جھنڈ میں گھنٹوں سرنگوں بیٹھا رہا۔ اُس وقت تک بیٹھا رہا جب تک مجھے اس کا یقین نہ ہو گیا کہ یہ گھاٹیاں عورت کے وجود سے پاک ہیں۔

مہندر:۔ میں دیکھ رہا ہوں اِس ویرانے کی زندگی نے آپ کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ دنیا عورت کو انسانیت کا مجسمہ سمجھتی ہے، سراپا محبت سمجھتی ہے اور آپ ہیں کہ اس کے سائے سے بھی خود کو دُور کیے ہوئے ہیں۔ کیا اِس تنہائی میں آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ سے قریب کوئی آپ کا غمگسار ہو؟ چاندنی راتوں میں کیا آپ کا دل چوڑیوں کی جھنکار سننے کے لئے بیقرار نہیں ہو اُٹھتا بھیا؟ کیا آپ ؟؟

امر:۔ (چیخ کر) بھگوان کے لئے خاموش ہو جاؤ مہندر۔ اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے میرے کانوں میں زہر نہ ٹپکاؤ۔ میں اس ویرانے میں بہت خوش ہوں۔ مجھے کسی بھی غمگسار کی ضرورت نہیں ہے۔ چوڑیوں کی جھنکار کی ضرورت نہیں، نقرئی قہقہوں کی ضرورت نہیں، چوڑیوں کی جھنکار سنکر میں یقیناً پاگل ہو جاؤں گا۔ (بادل زور سے گرجتا ہے، ہوا کا ایک جھونکا اندر آتا ہے، دونوں آسمان کیطرف دیکھنے لگتے ہیں)

امر:۔ (دھیمے لہجے میں) بارش کے آثار نظر آتے ہیں مہندر۔ آج لکڑیاں بھی نہیں ہیں (وہ کلہاڑی اُٹھا لیتا ہے) تم یہیں میرا انتظار کرو، میں لکڑیاں لے آؤں۔

(وہ باہر چلا جاتا ہے۔ مہندر ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہے۔ وہ دروازہ بند کر کے موم بتی جلاتا ہے اور میز پر سے ایک کتاب اُٹھا کر اسکی ورق گردانی شروع کرتا ہے —— وقفہ —— یکایک قدموں کی چاپ سُنائی دیتی ہے، کوئی تیزی سے اس طرف آ رہا ہے —— دستک)

مہندر:۔ ٹھہریئے بھیا —— کھول رہا ہوں میں دروازہ۔ (وہ چند کتابیں موم بتی کے چاروں طرف رکھ دیتا ہے تاکہ موم بتی ہوا کے جھونکوں سے محفوظ رہے —— دوبارہ دستک —— وہ آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا ہے۔ لیکن دروازہ پر امر کی جگہ ایک لڑکی کو دیکھتا ہے تو حیرت سے اس کا منہ کھُلا رہ جاتا ہے، لڑکی جلدی سے اندر آ جاتی ہے)

لڑکی:۔ میں اِس ویرانے میں راستہ بھول گئی ہوں۔ مجھے معاف کیجئے۔ بارش ہونے لگی اور میں نے دُور سے یہاں روشنی دیکھی تو اِسی طرف چلی آئی۔

مہندر:۔ آپ تو بالکل بھیگ گئی ہیں — ادھر آئیے نا — انگیٹھی سے قریب (وہ کرسی انگیٹھی سے قریب کر دیتا ہے۔ لڑکی بیٹھ جاتی ہے) معاف کیجئے گا۔ میرے پاس اس وقت دوسرے کپڑے بھی نہیں۔ اب بارش کے تھمنے تک آپ کو انہیں گیلے کپڑوں میں رہنا ہوگا۔

لڑکی:۔ مجھے دوسرے کپڑوں کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں صرف بارش کے تھمنے تک ٹھہرنا چاہتی ہوں — (وقفہ) اُف کتنی ہیبت ناک ہیں یہ گھاٹیاں! (پھریری سی لے کر) دن کی روشنی میں یہ جتنی حسین معلوم دیتی ہیں اتنی ہی راتوں کو ڈراؤنی نظر آتی ہیں۔

مہندر:۔ آپ نے سخت غلطی کی جو رات کے وقت باہر نکلیں — انجان لوگوں کے لئے یہ گھاٹیاں واقعی خطرناک ہیں۔

لڑکی:۔ ہمارے ساتھی آج سہ پہر سے ندی کی سیر کو گئے ہوئے ہیں۔ میرے سر میں درد تھا اس لئے میں ان کے ساتھ نہ جا سکی۔ نہ جانے کیوں وہ شام تک نہ لوٹے۔ جب مجھے طوفان کے آثار نظر آئے تو میں خود انکی تلاش میں نکلی، لیکن راستے سے بھٹک گئی۔ پتہ نہیں وہ لوگ واپس آئے یا نہیں۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ ہمارا کیمپ کس طرف ہے۔ (مہندر ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے اس حسینہ کا جائزہ لے رہا ہے)

مہندر:۔ آپ مطمئن رہیئے، میں پہنچا دوں گا آپ کو کیمپ میں — میں اِن وادیوں کے چپے چپے سے اچھی طرح واقف ہوں۔

لڑکی:۔ آپ کے یہاں مجھے پناہ نہ ملتی تو شاید میں زندہ نہ بچتی۔ سُنا ہے اِن وادیوں میں راتوں کو اکثر بھیڑئیے اور تیندوے پھرا کرتے ہیں — لیکن!! — آپ؟؟ (وہ غار کا جائزہ لیتی ہے اور اس کی نگاہیں بندوق پر سے ہوتی ہوئیں مہندر پر رُک جاتی ہیں) آپ تو شکاری ہیں شاید !!!

مہندر:۔ (موضوع بدلنے کے ارادے سے) جی ہاں، میں یہاں شکار ہی کی غرض سے آیا ہوں — آپ تو سردی سے کانپ رہی ہیں!! — یہ میرا چیسٹر لے لیجئے نا۔

لڑکی:۔ لیکن آپ؟؟ (وہ اس کا جواب نہیں دیتا اور آگے بڑھکر اپنا چیسٹر پیش کرتا ہے وہ پہلے تو ہچکچاتی ہے لیکن بعد کو لے لیتی ہے)

مہندر:۔ (چیسٹر پہناتے ہوئے) اب آپ سردی سے محفوظ رہینگی۔ بدقسمتی سے میرے پاس اس وقت قہوہ بھی نہیں ورنہ گرم قہوہ کا ایک کپ آپ کے لئے بے حد مفید ثابت ہوتا۔

لڑکی:۔ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے اسے میں عمر بھر نہ بھول سکونگی — ماتا جی اور اشوک بھی آپکے ہمیشہ احسانمند رہیں گے۔

مہندر:۔ آشوک؟ — آشوک کون؟؟؟ — آپ کے بھائی؟؟

لڑکی:۔ جی نہیں۔ (نظریں نیچی کرکے) وہ میرے منگیتر ہیں۔

مہندر:۔ (نااُمیدی سے) اوہ!!! — (ہوش میں آکر) معاف کیجئے گا دیوی، میں نے انہیں آپ کا بھائی سمجھا۔

لڑکی:۔ میرا نام صرف میرا ہے شکاری صاحب۔

مہندر:۔ اور میرا نام صرف مہندر ہے میرا دیوی۔ (دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں)

میرا:۔ میں سوچ رہی ہوں اگر ہماری ملاقات شہر میں ہوتی تو کیا ہم اتنی جلدی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو سکتے۔

مہندر:۔ کبھی نہیں میرا دیوی۔ ہم نے خود کو کھوکھلے رسموں میں قید کر کے اپنی زندگی اجیرن کر لی ہے۔ تکلف نے ہمیں انسان نہیں بلکہ مشین بنا دیا ہے۔

میرا:۔ میں دیکھ رہی ہوں ہمارے خیالات بہت ملتے جلتے ہیں۔ میں تو تنگ آگئی تھی شہر کے ہنگاموں سے۔ ان ہنگاموں سے بچنے کے لئے ہی ہم سب یہاں چلے آئے۔

مہندر:۔ مجھے بھی شہر کے ہنگاموں سے سخت نفرت ہے میرا دیوی۔ اسی لئے آج چھ برس سے میں ایک چھوٹے سے قصبے میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔

میرا:۔ اور شاید جب وہاں کی زندگی سے طبیعت اُکتا جاتی ہو گی تو آپ شکار کی تلاش میں یہاں آجاتے ہوں گے۔ اسی لئے تو اس غار میں ایک انسان کے آرام و آسایش کی تقریباً تمام چیزیں ہیں — چارپائی — انگیٹھی، کھانے پینے کا سامان اور پڑھنے کے لئے کتابیں — (وہ اُٹھ کر چند کتابیں اُٹھا لیتی ہے اور انکی گرد صاف کر کے ان کے نام پڑھنے لگتی ہے) — شکست، تلخیاں، And Quiet Flows The Don خوب!!! (وہ کتابیں رکھ دیتی ہے) لیکن ایک بات مجھے پسند نہیں مہندر بابو۔ نہ جانے بے زبان جانوروں کو مارنے میں آپ کو کیا لطف آتا ہے۔

مہندر:۔ (جلدی سے) آپ مجھے غلط نہ سمجھیں میرا دیوی۔ مجھے شکار سے قطعی دلچسپی نہیں — دراصل یہ —!!

(اُسے یکایک اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ رُک جاتا ہے)

میرا:۔ لیکن مہندر بابو — آپ کی یہ قیام گاہ؟؟

مہندر:۔ (موضوع بدلتے ہوئے) میرے خیال میں اب بارش کم ہو گئی ہے میرا دیوی — اگر آپ کہیں تو میں دروازہ کھول دوں۔

(وہ دروازہ کھول دیتا ہے۔ بارش تھم چکی ہے اور مطلع بھی صاف ہے۔ آسمان پر زرد سا چاند بیمار سی روشنی دے رہا ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے اور موم بتی گل ہو جاتی ہے۔ مہندر دروازے سے قریب کھڑا ہے۔ میرا کی نظریں چاند کی روشنی میں چمکتے ہوئے برفیلے پہاڑوں پر پڑتی ہیں تو وہ بھی مسحور اس کے پہلو میں جا کھڑی ہوتی ہے)

مہندر:۔ (خواب آلودہ آواز میں) دیکھ رہی ہیں میرا دیوی۔ اس زرد سی چاندنی میں برف سے لدی پہاڑی چوٹیاں کتنی مسحور کن معلوم ہو رہی ہیں۔ فضا کی اِن لامحدود وسعتوں میں ہر طرف امن ہے اور خاموشی ہے اور سکون ہے۔ ایسے مناظر میں کبھی دیکھتا ہوں تو دل بے اختیار چاہتا ہے کہ زندگی مسلسل ایک ایسی ہی رات بن جائے۔

میرا:۔ (دھیمے لہجے میں) ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں نے ان پہاڑوں کو ہیبت ناک کہا تھا مہندر بابو۔ لیکن نہ جانے کیوں اب دل بے اختیار چاہ رہا ہے کہ ساری زندگی اِن حسین وادیوں کی آغوش میں گزار دی جائے۔

(دونوں پہلو بہ پہلو خاموش کھڑے ہیں۔ موم بتی بجھ چکی ہے۔ انگیٹھی میں آگ دہک رہی ہے اور غار کی دیواروں پر سائے سے ناچ رہے ہیں۔ رات کی اس پر اسرار خاموشی میں یکایک رائفل کی آواز آتی ہے۔ بندوق کی آواز سے گھاٹیاں گونج اٹھتی ہیں۔ دونوں چونکتے ہیں)

میرا:۔ بندوق کی آواز؟؟ —— شاید اشوک وغیرہ میری تلاش میں نکلے ہیں۔

(مہندر خاموش ہے۔ وہ اپنی تیز نگاہوں سے دُور دُور تک پھیلے ہوئے پہاڑی راستوں کا جائزہ لے رہا ہے لیکن پگڈنڈیاں سنسان ہیں وہ جلدی سے بندوق اٹھالیتا ہے اور دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

میرا:۔ آپ جا کہاں رہے ہیں؟ —— ٹھہریئے —— میں بھی چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔

مہندر:۔ آپ گھبرایئے نہیں میرا دیوی۔ میں ابھی آتا ہوں —— دروازہ اندر سے بند کر لیجئے گا۔

(وہ میرا کے جواب کا انتظار کئے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں پر غائب ہو جاتا ہے۔ میرا ایک ٹھنڈی سانس لیتی ہے۔ ہوا کے سرد جھونکے چل رہے ہیں۔ وہ انگیٹھی سے قریب کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ اُسے بیٹھے ہوئے ابھی چند ہی منٹ ہوئے ہیں کہ اُسے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے اور پھر غار کے دہانے سے قریب ایک سایہ سا نظر آتا ہے۔ وہ گھبرائی ہوئی نگاہوں سے آنے والے کو دیکھنے لگتی ہے۔ امر لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ غار میں روشنی کم ہے)

امر:۔ (تھکی ہوئی آواز میں) بھگوان کے لئے مجھے سہارا دو مہندر —— میں زخمی ہو گیا ہوں۔

(وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور بستر پر گر جاتا ہے)

امر:۔ (دھیمے لہجے میں) تم وہاں بیٹھے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو مہندر؟ میرے بازو میں لگی ہے گولی۔

(وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ میرا سے وہاں خاموش بیٹھا نہیں جاتا۔ وہ اُٹھتی ہے اور اُس سے قریب جاتی ہے۔ وہ میرا کو دیکھ کر اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے)

میرا:۔ آپ لیٹے ہی رہیئے۔ میں ابھی زخم دھو کر پٹی باندھ دیتی ہوں۔

امر:۔ آں ——؟؟ —— کیا کہا تم نے؟ —— لیکن!! —— لیکن تم ہو کون؟ —— مہندر کہاں ہے؟؟

میرا:۔ (اسے دوبارہ لٹاتے ہوئے) آپ لیٹے رہیئے نا —— آپ کے زخم سے بہت سا خون نکل چکا ہے۔

امر:۔ (ذرا تیز لہجے میں) میں پوچھتا ہوں تم ہو کون؟؟ —— یہاں تک آنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟

میرا:۔ آپ زیادہ بولئے نہیں —— ہٹایئے اپنا ہاتھ زخم پر سے۔

(امر اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ میرا اسکی قمیص ہٹا کر زخم دیکھتی ہے۔ پھر زخم دھو کر اُس پر پٹی باندھ دیتی ہے۔ وہ موم بتی روشن کرتی ہے تو شراب کی بوتل پر اسکی نظریں پڑتی ہیں۔ وہ گلاس میں تھوڑی سی شراب اُنڈیل کر اُس کے ہونٹوں سے لگا دیتی ہے)

میرا:۔ اب کیسی ہے آپ کی طبیعت؟ زخم سے خون بہنا بند ہو گیا ہے۔ مہندر بابو لوٹ آئیں تو آپ کو کسی قریبی اسپتال میں پہنچا دیا جائے۔

امر:۔ (آہستہ سے) اسپتال میں؟ ـــــ نہیں نہیں۔ میں اسپتال ہرگز نہیں جاؤنگا، ہرگز نہیں جاؤنگا۔ (وہ آنکھیں بند کرلیتا ہے)

میرا:۔ اسپتال کے نام ہی سے پریشان ہو گئے؟؟ آپ گھبرایئے نہیں، معمولی ساز خم ہے۔ صرف مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔

امر:۔ (آنکھیں کھول کر) میں اور اسپتال سے گھبرا جاؤں؟ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی ساری زندگی موت کی آغوش میں گزاری ہے ـــــ لیکن آج میں اسپتال جانا نہیں چاہتا ـــــ میں وہاں ہرگز نہیں جاسکتا۔

میرا:۔ لیکن کیوں؟؟

امر:۔ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ـــــ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں تم کون ہو؟

میرا:۔ میں بھی آپ کی طرح ایک انسان ہوں ـــــ آپ کچھ دیر سو جایئے تو درد کم ہو جائے گا۔

امر:۔ یوں باتیں نہ بناؤ۔ آج تک یہاں کسی عورت کا سایہ تک نہیں آیا۔ آج تمہیں اپنے سے اس قدر قریب دیکھ کر مجھے اپنی بینائی پر یقین نہیں آتا ـــــ (وقفہ) ـــــ شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اکثر خوابوں میں حسین لڑکیاں دیکھی ہیں ـــــ لیکن تم پریشان نظروں سے مجھے کیوں دیکھ رہی ہو؟ خدا کے لئے مجھ سے ڈرو نہیں، میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں ـــــ (وقفہ) ـــــ اُف کتنی حسین ہو تم ـــــ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تم آسمانی دنیا کی ایک اپسرا ہو۔ شاید بھگوان نے میری تنہائی پر رحم کھا کر تمہیں یہاں میرے پاس بھیجا ہے ـــــ (وہ اُٹھکر اُس کے دونوں شانے تھام لیتا ہے)

میرا:۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) چھوڑ دو مجھے ـــــ!! بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو۔

امر:۔ (مسکراتے ہوئے) ڈر گئیں تم؟ سنا کرتا تھا جب عورت وحشی ہرن کی طرح خوفزدہ ہو جاتی ہے تو وہ بیحد حسین معلوم دیتی ہے۔ آج مجھے اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ تم خوف سے کانپ رہی ہو، تمہارے عنابی ہونٹ لرز رہے ہیں۔ تمہارے سینے کا اُتار چڑھاؤ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ تم مجھ سے بیحد خائف ہو ـــــ لیکن بہتر مجھ سے ڈرو نہیں۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا (اندوہگین لہجے میں) ـــــ اُف!! ـــــ آج چھ برسوں میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں ایک حسینہ کو اپنے سے اس قدر قریب دیکھ رہا ہوں۔

میرا:۔ (اُس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرتے ہوئے) چھوڑیئے مجھے۔ بھگوان کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔

(وہ اپنی آنکھوں میں وحشیانہ چمک لئے اُسے گھور رہا ہے، میرا کی اس سے نظریں ملتی ہیں تو خوف سے اس کے منہ سے ایک چیخ نکل جاتی ہے، وہ خود کو اسکی گرفت سے چھڑا لیتی ہے اور دروازے کی طرف دوڑتی ہے۔ دروازہ پر مہندر کو دیکھتی ہے تو اس سے لپٹ جاتی ہے)

میرا:۔ بچاؤ مجھے ـــــ بھگوان کے لئے بچاؤ ـــــ اُف بھگوان!! ـــــ یہ وحشی!!! ـــــ (وہ رونے لگتی ہے)

مہندر:۔ (پریشان لہجے میں) کیا ہوا میرا دیوی؟ ـــــ یہ میں ہوں ـــــ مہندر!!! یہاں آپ محفوظ ہیں (اس کی نظریں امر پر پڑتی ہیں تو وہ رُک جاتا ہے)

میرا:۔ (گھٹے ہوئے گلے میں) مجھے اُس وحشی سے بچایئے۔ اس کی نیت خراب ہے۔ یہ مجھے پاگل معلوم ہوتا ہے۔

امر:۔ (خشک لہجے میں) کون ہے یہ مہندر ـــــ؟؟

مہندر:۔ اسکی عزت پر حملہ کرکے اب پوچھ رہے ہیں آپ کہ یہ کون ہے؟ —— (غصہ سے) آپ کو شرم آنی چاہیئے بھیا!!!

میرا:۔ آپ نے اسے بھیا کہا مہندر بابو؟؟

مہندر:۔ ہاں میرا دیوی —— بدقسمتی سے یہ میرے بھائی ہیں۔

امر:۔ بدقسمتی سے مہندر؟ —— تو اب میرا وجود تیرے لئے اس قدر کوفت کا باعث بن گیا ہے؟

مہندر:۔ جی ہاں۔ یہ میری بدقسمتی ہے جو میں آپ کا بھائی ہوں۔ اس روپوشی نے تو آپ کو حیوان بنا دیا ہے۔ آپ نے ایک بیکس عورت کو اپنی پناہ میں دیکھا تو لگے اسے اپنی حیوانی خواہشات کا شکار بنانے۔ آپ یہ بھول گئے کہ وہ ایک مہذب تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور آپ ایک وحشی ہیں۔ وہ سوسائٹی کی ایک اعلیٰ فرد ہے اور آپ سوسائٹی سے نکالے ہوئے ایک ذلیل انسان ہیں۔

امر:۔ (جوش میں) خاموش ہو جا مہندر۔ بہت سن چکا میں تیری بکواس۔ مجھے تیری سوسائٹی اور تیری دنیا کی رتی بھر بھی پرواہ نہیں۔ دور ہو جاؤ تم دونوں میری آنکھوں سے۔ مجھے اب کسی ساتھی کی ضرورت نہیں، دوست کی ضرورت نہیں —— میں!! —— اُف بھگوان!!!

(وہ جگر تھام لیتا ہے اور لڑکھڑاتا ہوا پلنگ تک جاتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے سے پہلے چکرا کر گرتا ہے)

مہندر:۔ (چیخ کر) امر بھیا!!! (وہ آگے بڑھ کر اُسے سہارا دیتا ہے)

میرا:۔ یہ زخمی ہو گئے ہیں مہندر بابو۔ ان کے زخم سے دوبارہ خون بہہ رہا ہے۔ انہیں فوراً کسی قریبی اسپتال میں پہنچا دیجئے۔

مہندر:۔ (دھیمے لہجے میں) ہم انہیں اسپتال نہیں لیجا سکتے میرا دیوی۔ آپ کو نہیں معلوم یہ فوج کے مفرور سپاہی ہیں۔

میرا:۔ (حیرت سے) فوج کے مفرور سپاہی ہیں؟؟

مہندر:۔ تم انہیں غلط نہ سمجھو میرا دیوی۔ میرے بھائی امر ہیں، ہندوستان کے مشہور ادیب امر!!

میرا:۔ (حیرت سے) انقلابی ادیب امر ——؟ لیکن انہوں نے اپنا یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟

مہندر:۔ یہ سب قسمت کے چکر میں میرا دیوی کہ ہندوستان کا سب سے بڑا فنکار آج یہاں وحشیوں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

امر:۔ (کروٹ لیتے ہوئے بڑبڑاتا ہے) چلے جاؤ تم دونوں یہاں سے۔ آج سے امر مر گیا —— تمہارا بھائی مر گیا۔

مہندر:۔ بھیا!! —— امر بھیا!! —— کیسی طبیعت ہے آپ کی؟

امر:۔ آں؟ ہے —— کیا کہا تم نے؟۔ (وہ آنکھیں کھول دیتا ہے، میرا پر اس کی نظریں پڑتی ہیں تو وہ بے اختیار چیخ اٹھتا ہے) تم آگئیں شیاما؟ —— میں نے چھ برس تمہارا انتظار کیا ہے۔ تم خوف زدہ نظروں سے مجھے کیوں دیکھ رہی ہو؟ کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں امر ہوں —— تمہارا امر ہوں!!!!

مہندر:۔ بھیا —— بھیا!! —— کیا آپ ہوش میں ہیں؟

امر:۔ (وہ مہندر کو دیکھتا ہے تو اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) کون تو؟ —— مہندر؟ (قہقہہ لگاتا ہے) تو شیاما آجکل تیرے ساتھ ہے!!!

مہندر:۔ (گھٹے ہوئے گلے میں) بھیا!! —— بھگوان کے لئے ہوش میں آیئے۔

امر:۔ بند کر اپنی بکواس۔ میں کسی کا بھیا ویا نہیں (وہ دیوانہ وار قہقہہ لگاتا ہے) میں ایک بزدل سپاہی ہوں، ایک وحشی درندہ ہوں، تیری سوسائٹی سے نکالا ہوا ایک ذلیل انسان ہوں (وہ دوبارہ قہقہہ لگاتا ہے)

مہندر:۔ (گھٹے ہوئے گلے میں) مجھے معاف کیجئے بھیا۔ میں جوش میں نہ جانے کیا کیا بک گیا۔ آپ ہندوستان کے سب سے بڑے ادیب ہیں۔ سوسائٹی کے ایک عزت مند فرد ہیں، میرے بھائی ہیں، آپ امر ہیں۔

امر:۔ (غصہ سے) خاموش ہو جا مہندر تو —— تیرا بھائی مر گیا۔ ہندوستان کا سب سے بڑا ادیب مر گیا، امر مر گیا اب ایک وحشی زندہ ہے!!!

(وہ قہقہے لگاتا ہوا دروازہ کی طرف بڑھتا ہے۔ مہندر اُسے روکنے کی کوشش کرتا ہے لیکن روک نہیں سکتا)

مہندر:۔ ٹھہرو بھیا۔ بھگوان کے لئے ٹھہر جاؤ —— باہر موسم بہت خراب ہے!!

امر:۔ مجھے موسم کی پرواہ نہیں مہندر۔ مجھے کسی کی بھی پرواہ نہیں —— میں امر ہوں —— ہندوستان کا سب سے بڑا ادیب۔

امر!!! —— آ ہا ہا ہا ہا —— (وہ دیوانہ وار قہقہے لگاتا ہوا پہاڑیوں کی طرف بڑھتا ہے)

میرا:۔ امر بابو —— !!

مہندر:۔ (چیخ کر) بھیا —— امر بھیا!!!

(وہ اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ پہاڑی وادیاں اُس کی چیخوں سے گونج اُٹھتی ہیں۔ اسٹیج پر یکایک اندھیرا ہو جاتا ہے —— پردہ اچانک گرتا ہے)

غیاث احمد گدی

دیوتا

اس کے ذہن کی سطح پر جیسا فیروزہ رنگ کے سوت میں لپٹی لپٹائی ابھری اور ایک طنزیہ قہقہہ لگاتی ہوئی پھر وہیں ڈوب گئی۔ اور یکایک اس نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے گالوں پر طمانچے مارے ہوں جس کی شدید چوٹ سے پیدا شدہ جلن اس کے گالوں پر چنگاریوں کا کام کر رہی ہے اور اس میں اتنی سکت بھی باقی نہ رہی ہو کہ ان چنگاریوں پر ہاتھ پھیر کر اسے بجھا دے۔ انگلیوں کے درمیان سلگتا ہوا سگریٹ لرز کے رہ گیا۔ اس نے نیچے کی طرف جھانک کر دیکھا۔ ایک سو دس فٹ کی بلندی پر سے کوئلے کی یہ کان اسے دھرتی کے سینے کا زخم نظر آئی۔ یہ زخم جس نے ناسور کی صورت اختیار کر لی تھی، ہر لمحہ گہرا ہوتا جاتا تھا۔

ہزاروں نیم عریاں مزدور کوئلے کی سیاہی میں ڈوبے ہوئے کہ جنہیں پہچاننا بھی مشکل تھا اس زخم کو لمحہ بہ لمحہ گہرا کرتے جا رہے تھے، جب نیم عریاں مزدور تہ خانے کی صورت میں اندر کو گئی ہوئی کان سے قطار در قطار نکل رہے ہوتے تو اس ایک سو دس فٹ کی بلندی پر انسانوں کی یہ قطار جس کے لوگ اپنے سروں پر کوئلے سے بھری ہوئی بید کی ٹوکری رکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے رینگنے والے کیڑے معلوم ہوتے۔ یہ کیڑے جو دھرتی کے سینے سے کوئلے لیکر آتے اور انسانی ضروریات کے لئے خود سطح انسانی سے نیچے گر چکے تھے۔

کان نئی تھی، کام ابھی ابھی شروع ہوا تھا۔ تیس فٹ مٹی کاٹ لینے کے بعد معمولی کوئلے کی ایک موٹی تہ آگئی تھی، کیڑوں نے اسے بھی چاٹ لیا تھا۔ اور اب وہ اندر تہ خانے کی صورت میں کوئلے کاٹنے جاتے تھے۔ ٹالی کے لئے لائن کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لئے مزدوروں کو ایک سو دس فٹ کی بلندی کوئلے سے بھری ہوئی ٹوکریاں سروں پر رکھ کر چڑھنا پڑتی۔ جاڑے کی تھرتھری پیدا کر دینے والی سردی ان مزدوروں کے لئے کچھ آرام کا سامان بہم پہنچاتی۔ مگر گرمی کی اس شدت میں بھی وہ اس بلندی کو ہنستے کھیلتے طے کر جاتے۔ جسم سے پسینے چھوٹتے جاتے جسے خشک کئے بغیر وہ کان کے تاریک راستے میں گم ہو جاتے۔ لیکن جب آفتاب دور مغرب کے زینے اترنے لگتا اور میلی میلی زرد دھوپ کولری کی تمام فلک بوس چمنیوں، کوئلے کے سلگتے ہوئے بھٹے پر سے آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی، اور چمنیوں اور بھٹوں سے نکلتا ہوا دھواں فضا کو وقت سے پہلے تاریک کر دیتا۔ تو کولری کی دنیا میں ایک مخدوش قسم کی اداسی اور خاموشی بکھر جاتی۔ کان میں کام کرنے والے نیم عریاں مزدور تھک کے چور ہو جاتے۔ ان کی چال میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جاتی اور وہ پاس ہی مٹی اور پھوس کے غلیظ گھروں کی جانب گردن اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگ جاتے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑے ہوئے دس گھنٹے کی سزائے سخت کے بعد فطری طور ان بچوں کو دیکھنے کی خواہش انھیں بے تاب کر دیتی —— اتنے میں بھونپا ہوتا، مگر مزدوروں کے چہروں پر آزاد کئے جانے والے قیدیوں کی سی مسرت بکھر جاتی، اور وہ اپنے کندھوں پر کدال اور ٹوکریاں رکھے اچھلتے کودتے ہنستے کھیلتے جھونپڑوں کی طرف بڑھنے لگتے۔

مزدوروں کی قید کی میعاد ختم ہوئی۔ ادھر گوپال کے جیل جانے کا وقت ہو جاتا، جب سے جینا اس کی آرزوؤں پر لات مار کر چلی گئی تھی۔ گھر اسے جیل ہی لگتا۔ بیزار طبیعت نہ چاہتی مگر جیل جیل ہی تو ہے۔ جانا پڑتا۔ لیکن آج خلاف معمول وہ یونہی درخت کے نیچے بیٹھا رہا۔ اسی جگہ بیٹھا کان سے نکلی ہوئی آخری مزدور عورت بھیگی کو دیکھتا رہا۔ بھیگی افسردہ تھکے ہوئے مسافر کی طرح قدم اٹھا رہی تھی۔ گوپال کو معلوم تھا بھیگی تمام مزدوروں سے نہ صرف کمزور تھی، بلکہ بدقسمت بھی۔ گوپال کو اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی اور بھیگی کی زندگیوں میں کتنی مماثلت تھی۔ وہ بھی اپنے گھر سے بیزار بھیگی بھی اپنی خانگی زندگی سے نالاں —— فرق یہ تھا کہ جینا گوپال کو چھوڑ کر چلی گئی تھی، اس طرح وہ تباہ تھا اور رنگو رہتے ہوئے بھی اس کی زندگی کو تلخ بنائے ہوئے تھا۔ گوپال کے ساتھ عورت کا ظلم تھا بھیگی کے ساتھ مرد کا، یہاں عورت ظالم تھی مرد مظلوم، وہاں عورت مظلوم مرد ظالم۔ خانگی زندگیاں دونوں کی ایک سی تھیں۔

جب سے گوپال نے بھیگی کی تلخ زندگی سے واقفیت حاصل کی تھی وہ بھیگی کو بڑی ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتا۔ وہ بھیگی کی زندگی کو اپنی تسلی کا باعث بنائے ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا انسان کتنا کمینہ ہے وہ بھیگی سے ہمدردی کرتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ اس قابل ہے بلکہ اس لئے کہ بھیگی سے ہمدردی کرتے ہوئے اسے اپنی زندگی کا تلخ ترین جام پیتے ہوئے قدرے سکون میسر ہوتا، ایک سہارا، جیسے ڈوبتے کو تنکے کا ہی ہو۔ بھیگی کو دیکھ کر ایک تسلی سی ہوتی گویا وہ تنہا نہیں ہے دنیا میں اور بھی اس جیسے ہیں۔ گوپال سوچتے سوچتے تھک گیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو کوئلوں کے بڑے بڑے سلگتے ہوئے بھٹوں کے سرخ شعلے سانپ کی زبان کی طرح تھرتھرا رہے تھے اور اسکے اردگرد ہلکا سرخ اجالا بکھر گیا تھا۔

بھیگی کو گئے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی، گوپال نے سوچا کہ یوں تنہا بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا، وہ اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اوپر والے دھوڑے سے آہ پھر چیخ پکار سنائی دی۔ وہ بھیگی کے کواڑ کی طرف بڑھ گیا۔ آج پھر رنگو بھیگی کو زدوکوب کر رہا تھا پرسوں گوپال نے اسے اس مذموم حرکت سے باز آنے کو کہا تھا، لیکن رنگو کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔

جب سے رنگو کا پیر کوئلے کی چٹان گر جانے کے باعث زخمی ہو گیا تھا اسے بیکار رہنا پڑتا۔ دس بجے وہ لکڑی کے سہارے شہر کی خیراتی ہسپتال جاتا اور پانچ بجے سے پہلے واپس نہ آسکتا، راستے میں شراب کی بھٹی تھی۔ دوسرے مزدوروں کو چنے اور پکوڑی کے ساتھ بوتل کی بوتل صاف کرتے ہوئے دیکھتا تو اس سے رہا نہ جاتا۔ بھیگی کسی نہ کسی طرح ہر تیسرے دن اُسے پیسے دیدیتی لیکن رنگو ہر روز اس بھٹی کے سامنے سے گزرتا اور ہر روز اس کے پاس پیسے نہ ہوتے تھے ہفتے میں تین دن تو وہ پیتا، باقی چار دن محض شراب کی بو سونگھنے پر اکتفا نہ کر سکتا، اس پر ستم یہ کہ بھٹی میں کوئی نہ کوئی مزدور ساتھی اس پر طنز کر جاتا، اور ڈیڑھ میل کا راستہ زہر کے گھونٹ پیتا گزارتا۔ پھر کسی نہ کسی بہانے بھیگی پر برس پڑتا اور پھر بھیگی کی موت آجاتی۔ لات سے، بانس کی چھڑی، جوتا، اینٹ جو کچھ بھی رنگو کے ہاتھ آتا وہ بھیگی کو پیٹتا جاتا۔ بھیگی روتی چلاتی زخمی کبوتر کی طرح زمین پر لوٹتی مگر رنگو کو رحم نہ آتا۔ بھیگی جو صبح باسی بھات کھا کر کام پر چلی جاتی واپسی پر پانی بھی نہ پی پاتی کہ رنگو اسے نیم بے ہوش کر دیتا۔

ایک مزدور کی مزدوری بارہ آنہ یومیہ تھی۔ بھیگی کے یہاں پانچ آدمی تھے۔ بھیگی، اس کا شوہر، اس کے تین بچے، کوئلری کی طرف سے دو سیر کے چاول مل جاتے مگر اس سے بھی کیا ہوتا ہے۔ رنگو کا جب پاؤں ٹھیک تھا، وہ بھیگی کے ساتھ کام کرتا تھا تو خرچ نکل جاتا تھا لیکن جب سے رنگو کا پیر زخمی ہوا بھیگی کو بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بارہ آنے میں کیا بنتا وہ منہ اندھیرے اٹھتی اور اپنے

اور اپنی بڑی لڑکی کے سر پر کوئلے سے بھری دو ٹوکریاں رکھتی اور جلدی جلدی شہر کے ہوٹل والوں کے ہاتھ بیچنے چلی جاتی، پو پھٹے جب وہ واپس آتی تو اس کے ہاتھ میں آٹھ دس آنے کے پیسے ہو جاتے اس طرح بھیگی بڑی مشکل سے گزر اوقات کر رہی تھی اس پر رنگو ہر روز شراب کے لئے پیسے طلب کرتا۔ ہفتے میں تین دن تو وہ اپنا اور اپنے بچّوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر رنگو کو پیسے دیتی لیکن رنگو ہر روز مانگتا، بھیگی کے پاس نہ ہوتے۔ رنگو کی دارو پینے کی خواہش اسے شیطانی حرکات پر مجبور کرتی، اور پھر لات، جوتے، ڈنڈا جو چیز بھی ہاتھ آ جاتی اسی سے بھیگی کو پیٹنے لگتا۔۔۔ سالی رنڈی! پیسے لا! یار کے پاس سے لا!۔۔ جس کے پاس فجر سے جاتی ہے۔۔۔ لا تری ماں۔۔۔ سوٗر کی جنی! ورنہ مارتے مارتے جان لے لوں گا۔ دگلی، شراب شراب۔۔۔ بانس کی چھڑی سے بھیگی کے جسم پر سرخ نشانات اُبھر آتے۔

"ٹھہر نالائق!" پرسوں ہی گوپال نے اسے ڈانٹا تھا۔ رنگو بھیگی بلّی بن گیا، اس کے ہاتھ سے چھڑی گر گئی۔

"عورت کو مارتے ہوئے شرم نہیں آتی تجھے؟"۔۔۔ بھیگی جو زدوکوب کے باعث اچھی طرح سانس بھی نہ لے سکتی تھی۔ گوپال کے پیر پکڑ کر لپٹ گئی۔ "گوپال بابو، گوپال بابو۔۔۔ ہمرے جان مار دیہیں بابو! سرگی کے باپو دارو پینے کا پیسہ مانگے ہے، مالک ہم اتنا کام کرے پھر بھی ہفتے میں ایک بار نہ پی سکے۔۔۔ پو سرگی کے باپو کے لئے دال بھات سے کاٹ کر پیسے دیت ہے، رام جانے روج روج کہاں سے پیسے لاؤں، ہو مالک، ارے باپ مری رے رام۔۔۔"

پرسوں ہی گوپال نے اسے ڈانٹا تھا تو اسے یقین ہو گیا تھا کہ رنگو اب بھیگی کو نہیں ماریگا لیکن آج تین دن گزرے تھے کہ وہ پھر اپنی کمینگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔۔۔ گوپال نے سوچا کہ آج پھر وہ رنگو کو اچھی طرح سمجھا دے اور اس پر بھی وہ راستے پر نہ آئے تو اسے معقول سزا دی جائے۔ لیکن رات تاریک ہوتی جا رہی تھی، اور جھونپڑوں کی غلاظت سے اٹی ہوئی موریوں اور کچی نالیوں نے اسے جانے سے باز رکھا۔ اور وہ بائیں طرف مڑ گیا، بائیں طرف بڑے سے بھٹے کی آگ کو بجھاتے ہوئے اسے گردھاری ملا۔

"گردھاری!"

"جی مالک" گردھاری نیچے آ گیا۔

"کیوں گردھاری تم لوگ رنگو کو منع کیوں نہیں کرتے؟ وہ کس بے دردی سے بھیگی کو پیٹتا ہے؟ کیا تمہاری پنچایت میں رنگو کے لئے کوئی قانون نہیں ہے؟"

"نہ مالک وہ پتی مہریا اپنے لڑت اپنے راجی ہو جات ہیں، ہمرے کا دَرکار اور پنچایت کو کا لگا پڑا ہے۔ گوپال بابو مرد تو مہریا کے دیوتا ہوت ہے دیوتا۔!"

"مرد تو مہریا کے دیوتا ہوت ہے دیوتا!" گوپال گھر واپس آ گیا راستہ بھر اس کے ذہن میں گردھاری کا یہ فقرہ گونجتا رہا۔ سماجی ماحول میں جنم اور ارتقا پاتے ہوئے اس فقرہ میں کوئی صداقت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ سوچتا رہا۔۔۔ اور جینا اس صداقت پر کیسی کاری ضرب لگا گئی تھی۔

"میں جا رہی ہوں، تمہارے دوست کے ساتھ سماجی اعتبار سے میرا نصب العین تمہاری پرستش ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن حقیقت اس کے

برعکس نکلی۔ دراصل مجھے اس دن سے تم سے نفرت ہو چکی تھی۔ جس دن تم میری امیدوں کے خلاف بدصورت نکلے تھے، اف وہ ناک وہ سیاہ رنگ اور وہ مکروہ آواز جو میں اپنے ساتھ لئے جا رہی ہوں، ایک نفرت کی میخ کی طرح تمہاری آواز میری سینے میں چبھی ہوئی ہے...... کاش میں اسے نکال سکتی"۔

ہونہہ دیوتا! کوئی جا کے بھیگی کے دل سے پوچھے — اور ایک زہر خند اس کے لبوں پر پھیل گیا۔

دوسرے دن رنگو ہسپتال ہی نہیں گیا۔ گوپال نے سوچا شاید دونوں میں ملاپ ہو گیا ہو، رنگو کے پاس پیسہ نہیں ہے اس لئے وہ ہسپتال ہی نہ گیا اب نہ وہ ہسپتال جائے گا اور نہ اسے بھٹی ملے گی، لیکن کان سے گھر پہنچے ہوئے آدھ گھنٹہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ گوپال کے کان میں پھر رونے چلانے کی آواز آئی۔

"یہ کیا ہو گیا ہے رنگو کو!..... رنگو ایسے نہیں مانے گا" اور وہ رنگو کی جھونپڑی کی طرف ہو لیا — بھیگی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی، بال بکھرے ہوئے تھے اور سر پر کاری ضرب لگ جانے کی وجہ سے خون نکل رہا تھا اور پاس ہی رنگو ہاتھ میں چھڑی لئے اسے گالیاں بکے جا رہا تھا۔ گوپال سے رہا نہیں گیا تو اس نے جھپٹ کر اس کا گریباں پکڑ لیا۔

"تو کم بخت ایسے راہ پر نہیں آئے گا!" شڑاپ... شڑاپ... شڑاپ... بانس کی چھڑی رنگو پر پڑنے لگی۔ — یہ دیکھ کر بھیگی نے گوپال کے پیر پکڑ لئے۔ "بابوجی! مالک اب کے چھوڑ دے بابو!"

"نہیں بھیگی آج میں اسے درست کر کے چھوڑوں گا"

"بابوجی!" بھوکی شیرنی کی طرح بھیگی لپکی اور گوپال کے ہاتھ سے چھڑی چھین کر اسے دھکا دیا، "ہے ہے ہمرے سامنے ہمارا آدمی کے مارے ہے — نگوڑا بابو ہوئے تو اپن گھر کے، جا جا — نوکری سے چھڑا دے لے — ہونہہ ہم جورو، مرد لڑے ہے ایک ہوت ہے، اے کے باپ کا کا جائے ہے، لاڈ صاحب کہیں کا....."

شور سن کر ادھر ادھر سے کچھ مزدور آ گئے، گوپال نے محسوس کیا جیسے صرف بھیگی ہی نہیں کوٹھری کے ادنےٰ سے ادنےٰ مزدور نے اپنے پھٹے ہوئے جوتے اس پر برسائے ہیں۔

"جاؤ جاؤ، کھڑے کا ہو۔؟" بھیگی گرجی اور گوپال کے قدم آپ ہی آپ گھر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر ہو لئے۔ ریلوے لائن کے قریب سے اس نے پلٹ کر دیکھا، رنگو ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ بھیگی جھکی ہوئی اس کے بازو پر ابھرے ہوئے چھڑی کے نشان دیکھ رہی تھی، اور اس کے سر سے خون بوند بوند کر کے رنگو کے قدموں پر گر رہا تھا، جیسے سچ مچ دیوتا کے پھول چڑھائے جا رہے ہوں۔

اسی دم جینا اس کے ذہن کی سطح پر ابھری اور ایک طنزیہ قہقہہ لگاتی ہوئی پھر وہیں ڈوب گئی۔

محمد علوی

کوکھ جلی

اماں کی کوکھ اللہ میاں نے کچھ ایسے کل پرزوں سے بنائی تھی کہ وہ سال میں ایک مورتی تو گڑھ ہی لیتیں! وہ تو خیر ہوئی کہ اماں دھان پان سی تھیں، ورنہ..... اللہ میرے دو پر بھی اکتفا نہ کرتیں۔

اب تک وہ اس دنیا میں چھ لڑکیوں کا اضافہ کر چکی تھیں، اور چھ مرتبہ ہی اپنی قسمت کو روتی رہی تھیں اور اللہ میاں جیسی پاک ہستی کو بھی کوسنے سے نہ چوکیں تھیں! اماں بیچاریں ——— ! ابا میاں کے ترش طعنوں سے تنگ آکر ہر مرتبہ خودکشی کی ٹھان لیتیں، لیکن وہ تو اچھا ہی ہوتا کہ بچی پیدا ہونے کے ایک مہینے بعد ہی اماں کا پچکا ہوا پیٹ پھر پھولنے لگتا۔ اور وہ اپنے اس خطرناک ارادے کو دل سے نکال دیتیں۔ کیونکہ انہیں یقین ہوتا کہ اب کے وہ ایک اچھا سا پیارا پیارا لڑکا ہی جنیں گی۔ اور پھر منتیں، نیازیں، نمازیں، وظیفے اور روزوں کا دور شروع ہوتا، پیٹ پھولتا جاتا۔ اور پھر کسی ٹھٹھری ہوئی رات میں ایک بہن کا اضافہ ہو جاتا۔ دادی اماں بڑا سا منہ بنا کر خبر دیتیں اور ابا میاں کے پان کی جگالی کرتے ہوئے منہ سے ایک بیل کے مانند بھاری اور پھیکی سی گالی نکلتی اور مکان کی بوسیدہ دیواروں میں سٹ سے پیوست ہو جاتی۔ ایک بہن میری کمر توڑتے توڑتے عاجز آکر زمین کھودنے لگ جاتی اور دوسری میری پتھر کے مانند بے جان کمر پر آدھمکتی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا اماں اپنی سال بھر کی کمائی میری کمر پر لادتی رہی تھیں۔!!

آج آسمان پر بادل بری طرح اپنی نمائش کر رہے تھے۔ بڑے بڑے پھیلتے ہوئے عجیب عجیب رنگ کے بادل ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو کر عجیب و غریب رنگ اختیار کر رہے تھے۔ سورج کی جلا دینے والی کرنیں آج بالکل ٹھنڈی ہو گئی تھیں اور چاروں طرف سرخی بکھر رہی تھی۔ ہوا کے خنک خنک جھونکوں سے سینے میں ایک ہوک سی اٹھتی، لیکن ربّو کے دھونکنے سے پیر جو سینے سے چمٹے ہوئے تھے اسے اندر ہی گوٹ ڈالتے۔ باہر سے بینڈ کی آواز آرہی تھی اور ساتھ ہی بچوں کی چیخ پکار سازوں کی لہروں پہ تھرک رہی تھی۔

آج پڑوس میں رہتی ہوئی راجو کا بیاہ تھا اور ہماری کوٹھڑی کے قریب ہی ایک بڑا سا منڈپ بندھا تھا، جسمیں رات بھر رنڈی ناچنے والی تھی۔ رنڈی کا ناچ ———؟ اوہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ جلد رات آجائے اور پھر رنڈی کا ناچ شروع ہو۔

لیکن ابھی تو سورج بھی غروب نہیں ہوا تھا کہ اماں کے پیٹ میں ٹیسیں اٹھنی شروع ہوئیں۔! اور وہ دالان سے اٹھکر کوٹھڑی میں جا گھسیں۔ اسی کوٹھڑی میں جس کی کھڑکیاں منڈپ کے سامنے کھلی تھیں۔ اور دادی، اماں کو ٹھڑی سے دالان میں، اور وہاں سے باورچی خانے میں، اور وہاں سے پھر دالان اور کوٹھڑی کے چکر کاٹنے لگیں۔

ابا میاں مردانے سے دالان میں آتے اور وہاں سے پھر مردانے میں جا گھستے۔ ان کے جھریوں بھرے چہرے پر اُمید
کے آثار ابھرے ہوئے تھے۔

چاروں بہنیں منڈپ میں ڈھول کی بارش برسانے چلی گئیں تھیں۔ اور رنو میرے پاس بیٹھی ٹوٹی ہوئی ہنڈیا کے
ٹکڑے کو ایسے چوس رہی تھی، جیسے وہ بڑھیا سی کھٹی میٹھی مٹھائی ہو۔ اماں کی سسکیوں کی آواز کوٹھری سے نکل کر دالان میں تیر رہی تھی،
تھوڑی ہی دیر میں بوڑھی دائی ماں آن دھمکیں اور کوٹھری میں جا گھسیں۔ پھر دو چار محلے والیاں اور خالہ پھوپھی بھی ٹھک ٹھک کر کوٹھری
پُر کرنے کے لئے آپہنچیں، اور میں باورچی خانے میں بیٹھی بیٹھی اماں کی کوکھ کو کوستی رہی۔

اور کیا کرتی۔ اب بھلا وہ بند کھڑکیاں کھلنے کی تھیں، اور ناچ ——؟ ہائے آگ لگے اس کوکھ کو۔ خدا خدا کرکے عمر بھر میں یہ پہلا
موقع تھا ناچ دیکھنے کا۔ ہاں یہ تو اُس بیچاری راجو کے ماں باپ کا بھلا ہو کہ وہ بیچارے ہمارے مکان کے قریب میں کرائے کے مکان میں
رہنے لگے تھے، ورنہ اس محلے میں تو سب سیدہ ہی بستے تھے، وہ بھلا کیوں رنڈیاں نچوانے لگے؟ انھیں تو وہ بڑی بڑی مونچھوں والے
قوال مبارک اور اُن کی دل ہلا دینے والی تانیں۔

دادی اماں ذرا ذرا سی دیر میں کوٹھری سے نکل کر دالان طے کرتیں، باورچی خانے میں آتیں اور مجھے ہدایت کر جاتیں۔

"دیکھنا بیٹی نعمت خانے میں چھاچھ رکھی ہوئی ہے، کڑھی بنا لینا، اور آج کھچڑی کچھ زیادہ پکا لینا اور ہاں ....
ہائے کیا کہتی تھی میں؟ —— ارے توبہ —— دیکھنا کتنے جلدی بھول جاتی ہوں میں ..... آگ لگے اس چھینے کو۔
—— کہیں کا نہ رہا اللہ کا مارا —— کیا کہہ رہی تھی میں ——؟ ہائے اللہ —— توبہ بھری —— اے ہاں بیٹی
اس پتیلے میں پانی گرم رکھدے —— ذرا جلدی کر بیٹی، بچی کو نہلا —— ہائے خاک میرے منہ میں —— بچے کو
نہلانے کے لئے ——!"

اور پھر کوٹھری کی طرف رینگتی ہوئی چلی جاتیں۔

ابھی نا بچہ ہوا تھا نہ بچی۔ لیکن دادی اماں کو یقین تھا کہ اب کے لڑکا ہی ہوگا، کیونکہ اماں کا پیٹ کچھ اندر اندر تھا
اور یہ لڑکے کی علامت ہے، ورنہ لڑکی والا پیٹ تو بہت ابھرا ہوا ہوتا ہے، اور پھر اب کے محلے میں جتنے بھی بچے پیدا ہوئے وہ مذکر ہی
تھے، یہاں تک کہ ہماری جمو بکری کے بھی دونوں بکرے ہی ہوئے تھے۔ اور پھر وہ منتیں، نمازیں اور وظیفے بھی کچھ نہ کچھ اثر چھوڑیں گی۔ ان
سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھلا اماں کیوں اس دین سے محروم رہتیں، ان کے بھی لڑکا ہونا ضروری تھا۔

دیر تک میں باورچی خانے میں بیٹھی کام کرتی رہی، اور اماں کی ہلکی ہلکی سسکیوں کو سنتی رہی، اور جب میں دالان میں نکلی تو کوٹھری
کے بند دروازوں کی جھریوں سے باریک باریک دھواں نکل کر عجیب عجیب زاویے بناتا ہوا دالان میں پھیل رہا تھا، اور کئی گہری گہری
بوئیں نتھنوں کو چھیدتی ہوئی دماغ میں گھسی جا رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں میرا سر چکرانے لگا اور آنکھوں میں جلن سی محسوس ہونے لگی، میں نے
اپنی آنکھوں کو گیلے آٹے کی طرح گوندڈالا اور "کھوں کھوں" کرتی یہ سوچتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بھاگی کہ یہ کوٹھری میں گھسی ہوئی

عورتیں اور اماں اب تک زندہ بھی ہیں یا ———؟!

انگیٹھی پر رکھی ہوئی دیگچی میں کڑھی اُبال کھا رہی تھی، کڑھی دیگچی کے باہر اُبل رہی تھی، میں نے جلدی سے ڈوئی اُٹھائی اور دیگچی میں ڈال دی۔ دو چار ٹھوکے پڑتے ہی کڑھی دیگچی میں نیچے کی طرف بیٹھ گئی —!

یک لخت دالان سے دادی اماں کی آواز سنائی دی، وہ ابا میاں سے کہہ رہی تھی۔

"لڑکی ہوئی ہے میاں ———!"

"اس کی تو ——— ! کم نصیب کہیں کی ———!"

ابا میاں کی آواز آئی اور میرا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روؤں، لیکن گلا خشک تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں اب کبھی نہ بول سکوں گی۔ گویا میری قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی —!

کڑھی میں ایک بار پھر اُبال آیا اور وہ دیگچی سے نکل کر انگاروں پر گرنے لگی۔

اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا، وہ گرتی رہے، گرتی رہے، اور دہکتے ہوئے سرخ سرخ انگارے ایک ایک کر کے سب بجھ جائیں۔ اور دیگچی خالی ہو جائے۔ بالکل خالی —!

لیکن کڑھی کے جلنے کی بو پاتے ہی دادی اماں دالان سے لپکیں، اور مجھے آرام سے بیٹھی ہوئی دیکھ کر بس بھنّا ہی تو اُٹھیں ———!

"اے ہے، موا ایسا بھی کیا چتیا کہ کڑھی اُبلے جا رہی ہے اور تم بیگم بنی اسے دیکھ رہی ہو۔ اُوئی ——— جیسے کڑھی اُبل نہیں رہی بلکہ تمہارے سامنے جل پریوں کا ناچ ہو رہا ہے، اے نوج یہ بھی کیا —! جوان ہو گئیں لیکن اب تک سگھڑاپا نہ آیا۔۔۔۔ ہائے ——— تمہارے لے جانے والے کا کیا حال ہو گا بیچارے کا ——— ؟ ٹلیا صاف کر دو گی ——— اور کیا ——— ! اوئی لڑکی دیکھتی کیا ہے ؟ اُتار بھی لے دیگچی۔ یا یونہی جلا دیگی سب ———؟!"

جی تو نہ چاہتا تھا کہ دیگچی اُتاروں، لیکن دادی اماں کی "لخ لخ" سُن کر دماغ میں سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں۔

ناچار دوشالہ لے دیگچی اتار کر فرش پر پٹک دی ———!!

رات کے دس بج چکے تھے، تاریکی ہر طرف ایسے پھیل گئی تھی جیسے کسی نے صاف شفاف پانی میں سیاہ رنگ گھول دیا ہو، چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، صرف منڈپ سے سازوں کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ مکان میں سب کھا پی کر فارغ ہو چکے تھے، دالان میں بجلی کا بلب اپنی سوکھی ہوئی کرنوں کو بجائے پھیلانے کے سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا، دادی اماں دن بھر دوڑ دوڑ کر اب کمر سیدھی کرنے چارپائی پر لیٹ گئی تھیں، اور لیٹتے ہی خراٹے بھرنے لگی تھیں۔ ابو منڈپ میں ابا میاں کے پاس چلی گئی تھی، اور چاروں بہنیں لحاف میں گھس کر ایک دوسرے کو گرماتے ہوئے سو گئی تھیں۔ دائی ماں بچی کو نہلا کر چلی گئی تھیں اور اب اماں اکیلی کوٹھری میں لیٹی ہوئیں شاید اپنے مستقبل پر غور کر رہی تھیں ———!

—— میں نے آہستہ سے بغیر آواز کئے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور اندر گھس گئی۔ واقعی وہاں ماں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں، اور پاس ہی میں بچی ایسی لیٹی ہوئی تھی جیسے وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ کوٹھری کی دونوں کھڑکیاں بند تھیں اور انکی درزوں سے روشنی ایسے جھانک رہی تھی جیسے ابھی شرما کر چھپ جائیگی۔!

میں ہولے سے ایک بند کھڑکی پر بیٹھ گئی اور چپکے سے ایک باریک مگر دکھ سکے ایسی درز سے آنکھ چپکا دی، باہر منڈپ آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور بیچ میں تھوڑی سی جگہ تھی جس میں رنڈی ایک بھاری سی ریشم کی ساڑی پہنے، جس پر ہاتھ بھر چوڑی گوٹ لگی ہوئی تھی، اپنا ایک ہاتھ کان پر رکھے اور دوسرا دولہا کی طرف بڑھائے ہوئے اپنی باریک آواز میں ایک طویل "آ آ آ" کھینچ کر بار بار ایک ہی مصرع دوہرا رہی تھی، ؎

"سو جا میری لاڈلی سو جا"

اور طبلچی اپنے پیٹ پر طبلے باندھے رنڈی کی داہیں طرف کھڑا انہیں زور زور سے دھمدھما رہا تھا، اور ساتھ ہی سارنگی والا اپنی گردن ہلا ہلا کر بری طرح گز چلا رہا تھا، اور فرش پر جہاں ایک بڑا سا پاندان رکھا ہوا تھا ایک تین چار سال کا خوبصورت سا بچہ بیٹھا ہوا اپنی غنودہ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ کر شاید تعجب کر رہا تھا، اور رنڈی ابتک وہی ایک مصرع دوہرا رہی تھی۔

"سو جا میری لاڈلی سو جا"

اور اب وہ دوسرا مصرع کہنے ہی والی تھی کہ ایک صاحب نے جو ڈیل ڈول سے کافی مالدار شخص تھے اپنی جیب سے ایک بوسیدہ نوٹ نکالکر رنڈی کو اپنی طرف مخاطب کیا دونوں میں کچھ دیر تک کھسر پسر ہوتی رہی، اور آخر میں رنڈی ایک پژمردہ پھولوں کا ہار لیکر ابا میاں کی جانب بڑھی اور اُن کے گلے میں ہار ڈال دیا۔

ابا میاں نے پہلے تو ہار سے بچنے کی کوشش کی لیکن جب ہار گردن میں پڑ گیا تو فوراً اسے گلے سے نکال گود میں ڈال لیا اور اپنی جیب سے شاید نوٹ نکالتے ہوئے رنڈی سے کانا پھوسی کرنے لگے، اور میں نے دیکھا کہ اکو ابا میاں کے پاس کھڑے کھڑے مسکرا رہی ہے۔

میں ابھی اور دیکھنے بھی نہ پائی تھی کہ دالان سے ربّو کی چیخیں سنائی دیں، اور میں ہڑبڑا کر دالان کی طرف بھاگی۔

ربّو جاگ اٹھی تھی اور اپنی عادت کے مطابق رات کا راگ الاپ رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ چڑیل کو جیتے جی دفنا دوں۔ چڑیل کہیں کی —— رات کو بھی تو چین لینے نہیں دیتی۔؟

ابھی ربّو خاموش ہی ہوئی تھی کہ باہر کا دروازہ کھلا اور اکو دوڑتے ہوئے اندر آن دھمکی اور ہنستے ہوئے مجھ سے بولی۔

"آپا غضب ہو گیا —— یا اللہ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا ہے —— ہائے ابا میاں بھی تو بس —— !" اور وہ ہنسنے لگی۔

"کیا ہوا ——؟" میں نے ویسے ہی سوال جڑ دیا۔

"ہائے آپا سُنو گی تو ہنستے ہنستے برا حال ہو جائیگا —— !" اور وہ پھر ہنس دی۔

"تو پھر کہہ کیوں نہیں دیتی ——— ؟!" میں سخت پریشان تھی۔

"اُوں ——— آپا تم تو ڈانٹنے لگیں — دیکھو نا بات یہ ہوئی کہ ——— !" اور وہ ایک بار پھر ہنس دی۔

"دیکھ اگو" کہنا ہو تو سیدھے سیدھے کہہ دے، ورنہ میں نہیں سنتی تیری یہ کھی کھی کھی ——— !" مجھے خواہ مخواہ غصہ آنے لگا۔

"اوہ ——— آپا نہیں سُنو گی تو پچھتاؤ گی ہوں ——— !" اس نے "ہوں" پر زور دیتے ہوئے کہا اور پھر ہنس دی۔

اب کے مجھے سچ مچ کا غصہ آنے لگا۔ جی چاہا اس ہنسی کے گول گپّے کو چانٹے مار مار کر آنسوؤں کا ڈھیر بنا دوں، لیکن خاموش رہی، کیا کرتی بات جو سُننی تھی —؟

اور وہ کہنے لگی ——— "آپا ——— !" اور پھر ہنس دی۔

"اُف ——— اگو" اب کے جو ہنسی تو جان لے تیری خیر نہیں، اور نہیں تو ——— ہنستی ہی چلی جا رہی ہے مردار کہیں کی!"

آخر میں نے غصہ اُتار ہی دیا۔

"نہیں نہیں آپا میں کہتی ہوں ——— کہتی تو ہوں — لیکن کیا کروں، ہنسی خود بخود آ جاتی ہے —؟ ہاں تو آپا وہ جو رنڈی ——— !" اور وہ ایک بار پھر ہنس دی۔

"اگو خدا کے لئے کہہ بھی دے — پھر نہیں تو اٹھاؤں ایک ساتھ ——— !" میری حالت غیر ہوئی جا رہی تھی۔

"ہائے آپا ——— اب جو ہنسوں تو میرا منہ کفن میں دیکھو تم ——— ! ہاں وہ جو رنڈی ہے نا ——— ؟ وہی جو منڈپ میں ناچ رہی ہے —؟ جب وہ ابا میاں کو ہار پہنانے آئی تو ابا میاں ——— ! یا اللہ یہ ابا میاں کو کیا عادت ہے، مہترانی سے لے کر نواب زادیوں تک جس کسی کے لڑکا دیکھا اسے کہہ دیا تم بہت خوش قسمت ہو ——— !" اور وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بھی ہنسی نہ روک سکی۔

"ہاں تو رنڈی سے کیا کہا ابا میاں نے ——— ؟!" میں نے اسے اصل موضوع پر لانا چاہا۔

"ارے وہ رنڈی سے بھی کہہ بیٹھے کہ تم بہت خوش قسمت ہو۔ تمہارے ایک چاند سا لڑکا ہے ——— !" وہ پھر ہنس دی۔
اس وقت وہ ہنستی زیادہ تھی اور باتیں کم کر رہی تھی، میں نے سوچا اسے بات پوری کر لینے دو پھر بتاؤں گی کہ تو رو بھی سکتی ہے۔

"اچھا ——— پھر کیا ہوا ——— ؟!"

"پھر — ؟" وہ کہنے لگی —! "پھر یہ ہوا کہ رنڈی نے نہایت ہی رونی صورت بنائے ہوئے ابا میاں سے کہا کہ "میاں یہ لڑکا میرے کس کام کا —؟ بڑا ہو کر آوارہ گردی شروع کر دیگا۔ ادھر ادھر کوٹھے چھانتا پھرے گا۔ مجھ سے روپیہ کا تقاضہ کریگا۔ مجھے مارے گا۔ پیٹے گا۔ اور جو نہ کرے گا سو تھوڑا ہے۔! کاش میرے ایک لڑکی ہوتی — تو میرا بڑھاپا کتنے آرام سے کٹ جاتا۔!" اور وہ ناچنے لگ گئی اور ابا میاں منہ بسورتے رہ گئے۔!" اب پھر وہ قہقہے لگانے لگی۔

بقیہ صفحہ ۶۳ پر

ستیش بترا

اُلجھنیں

میرے ذہن میں ایک عجب کھلبلی مچی رہتی ہے۔ دماغ ایک عجب اُدھیڑ بن میں لگا رہتا ہے۔ احساسات کی تُند لہریں سمندری موجوں کی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے پر اُمڈی چلی آتی ہیں۔ دماغ میں گویا کسی نے اُبلتا لاوا ڈال دیا ہو۔ خیالات نہایت سرعت کے ساتھ ذہن میں اُلجھ اُلجھ کر ایک نہایت مہین اور مضبوط جالا بننے میں لگے رہتے ہیں۔ دماغی خلا میں گویا دھواں سا بھر گیا ہو اور آس پاس کی چیزوں پر جیسے ایک جھلّی سی قائم ہو گئی ہو۔ معمولی معمولی باتوں میں میری قوتِ ارادی کام نہیں دیتی۔ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن میرا سوچنے سمجھنے والا دماغ میرا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ تم پوچھنا چاہتی ہو میری پریشانیوں کی وجہ کیا ہے؟ میں خود نہیں بتا سکتا!

رات کس قدر خاموش ہے! ہوا میں ایک خنکی ہے اور رات کی رانی کی خوشبو دُور دُور تک فضا میں تیر رہی ہے، میں لحاف میں لیٹا کھلی کھڑکی میں سے دیکھ رہا ہوں۔ چاند کی لطیف کرنیں بوڑھے پیپل کے پتّوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی سبز گھاس پر بکھرے دھبوں کی شکل میں ناچ رہی ہیں۔ اِس سے دور گہرے سیاہ درختوں کے درمیان مخملی گھاس پر بدمست عریاں چاندنی سو رہی ہے۔ کبھی کبھی بے تال جھینگر اپنی بھدی سروں میں میرا منہ چڑانے لگتے ہیں۔ مجھے نیند بالکل نہیں آتی۔ میرے ذہنی بھوت ڈراؤنی شکلیں اختیار کر کے میرے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں۔ دراصل یہ پریشانیاں کچھ نہیں یہ میری اپنی تخلیق ہیں۔ اب جبکہ میں انہیں ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں تو میں اپنے ارادوں میں ہمت اور اولوالعزمی کی کمی پاتا ہوں۔

میرا دماغ ابھی تک زور زور سے کام کر رہا ہے نہ جانے یہ کیا سوچتا رہتا ہے۔ جس وقت یہ سوچتا ہے تو میرا شعور پوری توجہ کے ساتھ اس کا ساتھ دیتا ہے اور پھر چند ہی لمحوں بعد ایک اور خیال ذہن کی تاریکیوں میں سے نکل کر اس کے ساتھ لپٹنے لگتا ہے حتیٰ کہ یہ خیالات گلو کے بیل کی طرح ایک دوسرے میں اس طرح خلط ملط ہو جاتے ہیں کہ مجھے یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ میں دراصل کس چیز کی بابت سوچ رہا تھا۔ دھک۔ دھک۔ دھک۔ میری ذہنی نبضیں ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگتی ہے اور میری بے چینی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

تم سمجھ رہی ہو میں بہک گیا ہوں، نہیں میں تمہیں اپنی ذات کے بہت قریب لانا چاہتا ہوں۔ مجھے پوری اُمید ہے تم مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کرو گی۔ مجھے تمہاری پاک اور بے لوث محبت پر پورا یقین ہے۔ میں فضا میں تمہارے لرزتے ہوئے پتلے پتلے کیف پرور سرخ سے ہونٹ دیکھ سکتا ہوں۔ اس سے دُور سمندر سے بھی زیادہ گہری سیاہ آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں، اور تمہارے چہرے پر بالوں کی

خوبصورت لٹیں بار بار ہٹانے کے باوجود تمہارے دہکتے ہوئے سرخ گالوں کو چومنے کے لئے بیقرار ہیں۔ تمہارے لبوں پر پُر اسرار مسکراہٹ ہے جس کا منبع اور دہانہ آج تک کوئی نہیں جان سکا۔ تمہاری آنکھوں میں ایک پیار بھرا اضطراب ہے جو میری ان الجھنوں کو دُور کرنے کے لئے بیقرار ہے۔ تم میری طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہو۔ تمہارے گلاب کی پتیوں کے سے مجوبہ سے ہونٹ فضا میں کپکپا رہے ہیں۔ تمہارے گورے گورے ہاتھ آگے بڑھتے ہیں اور میرے سوچنے سمجھنے والے دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ دھک۔ دھک۔ دھک۔ میری ذہنی نبض آہستہ چلنے لگتی ہے۔ کمرے میں پڑی ہوئی دھندلی چیزیں ہلکے ہلکے اندھیرے میں ڈوب جاتی ہیں۔ چاند کی نازک کرنیں میری بند آنکھوں کے پپوٹوں میں سے ایک دھندلی چمکدار لکیر کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ میری ذہنی ہلچل ایک پُر لطف سکون میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مجھے اپنی پیشانی پر صرف تمہاری نرم نرم انگلیوں کا احساس ہوتا ہے اور تمہارا پیار سے جُھکا ہوا چہرہ مجھے بند آنکھوں کے اندھیرے میں اور بھی صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ پھر یکدم تمہارے ہونٹ ہاں گرم گرم ہونٹ بڑھ کر میری پیشانی کو چوم لیتے ہیں۔ میرے جسم کی خنکیوں کو، میری ذہنی کمزوریوں کو، میرا الجھن سے بھرا دماغ دور کہیں سو جاتا ہے۔ میرے ناگوں کی طرح پھنکارتے ہوئے خیالات تمہارے گرم گرم سانسوں کی موسیقی سُن کر میری دماغی پٹاری میں چپ چاپ سو جاتے ہیں۔ تمہارے ہونٹوں کا نم دار لمس میرے جسم میں گھلتا چلا جاتا ہے اور مجھے صرف اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ تم میرے قریب ہو۔ بہت قریب۔ میں تمہیں چھو کر محسوس کر سکتا ہوں۔ مجھے ناز ہے کہ مجھے تمہاری بیش بہا محبت کا فخر حاصل ہے۔ مجھے یکایک احساس ہوتا ہے کہ میں تمہیں پا کر اپنی کمزوریوں پر ضرور حاوی ثابت ہوں گا۔

دراصل مجھ میں بہت بڑی کمزوریاں ہیں۔ بہت بڑی۔ تم کہو گی کہ کمزوریاں کس انسان میں نہیں ہوتیں؟ یہ شاید میری دیوانہ وار محبت تمہیں مجبور کر رہی ہے کہ تم میری کمزوریوں کو نظر انداز کر دو، لیکن آج تم مجھے ایک بالکل مختلف انسان پاؤ گی ——— ایک ایسا انسان جسے باوجود اس قدر قربت کے تم کبھی نہ جان سکی۔ ہر انسان کی دو شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ ایک وہ جو اُس کے خیال کے مطابق دنیا کو جاننی چاہیئے اور ایک وہ جس کے متعلق صرف وہ خود واقف ہے اور جو اکثر کرم خوردہ اور کھوکھلی ہوتی ہے۔ انسان اپنی باطنی شخصیت کے گرد ایک مضبوط خول بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اُس کی کمزوریاں صرف اُسی تک محدود رہیں۔ تم نے ابھی تک میرا ظاہری پہلو دیکھا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ابھی تک اپنی دوسری شخصیت تم سے چھپاتا رہا ہوں، لیکن یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے امید ہے تم مجھے معاف کر دو گی، لیکن آج میں یہ خول اُتار کر پھینک دینا چاہتا ہوں تاکہ تم مجھے قریب تر محسوس کر سکو۔

جہاں تک میرا خیال ہے میری کمزوریوں کی جڑیں میرے فطری طور پر احساساتی ہونے میں ہیں۔ میں ہر چیز کو نہایت شدت سے محسوس کرتا ہوں۔ اپنے آپ کو ہر فضا کا جزو بنا لیتا ہوں۔ تم مسکرا رہی ہو، تم شاید کہو گی یہ بھی کوئی کمزوری ہے؟ تمہارے خیال کے مطابق مجھے کہنا چاہیئے تھا کہ میں شراب پیتا ہوں، جوا کھیلتا ہوں، نازک اندام لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا ہوں۔ نہیں۔ میں ان سب چیزوں سے کوسوں دُور ہوں۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں صرف فطری طور پر احساسات کی لہروں میں بہہ جاتا ہوں اور شاید یہ موجودہ دنیا میں سب سے بڑی کمزوری ہے۔ دنیا کے چلتے پھرتے مہذب گنواروں میں حساس ہونا اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹنا ہے۔ مجھے دوسروں کے جذبات کو مجروح ہوتے دیکھ کر رحم آنے لگتا ہے۔ میں ہر وقت اپنے آپ کو دوسروں کے حالات کے سانچے میں ڈالتا رہتا ہوں۔ میں یہ محسوس کرنا چاہتا ہوں

کہ ایک انسان کو کسی خاص حالات میں کس قدر تکلیف ہوتی ہے، اور میرا یہ جنون اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس سے اکثر میرے دوستوں اور رشتہ داروں نے فائدہ اُٹھایا ہے۔ میں اُن کے فریب کو بھی حقیقت جان کر بڑے سے بڑا دھوکہ کھا جاتا ہوں، صرف اس لئے کہ میں اپنے جذبۂ رحم کو روک نہیں سکتا۔ لیکن پھر مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا میں خود غرضی کے سوا کچھ نہیں۔ موجودہ تہذیب اور اُس سے متعلق لمبی چوڑی ڈینگیں موقعہ پڑنے پر ہر شخص بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ موجودہ نظام میں اصولوں کے لئے کہا سُنا بہت جاتا ہے لیکن قدم قدم پر یہی اصول بڑی بے رحمی سے توڑے جاتے ہیں۔ جگہ جگہ پر اپنے جذبات کا واسطہ دلاکر دوسروں کے جذبات کو کچلا جاتا ہے۔ آجکل صرف وہی شخص کامیاب ہوسکتا ہے جس نے اپنی شخصیت کے گرد احساسات کو روکنے کے لئے نہایت مضبوط خول بنالیا ہو۔ میں یہ سب سوچتا ہوں اور میری الجھنیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

پھر میں اپنی شخصیت کے گرد نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے اپنی تعلیم اپنی ترقی کی راہ میں سخت رکاوٹ ڈالتی نظر آتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے میرے احساس کو اور بھی حساس بنا دیا ہے۔ میں سوچتا زیادہ ہوں اور عمل کم کرتا ہوں۔ تعلیم کا مقصد تو عام طور پر قوتِ ارادی کو مضبوط کرنا ہے لیکن میں جیسے ہر دوراہے پر رُک جاتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا ہے۔ میں ہر راستہ کے متعلق ہر مسئلہ کے پہلوؤں پر غور کرنے لگتا ہوں اور کئی بار صرف اسی بنا پر ٹھوکر کھاتا ہوں، صرف اس لئے کہ میرا احساس دماغ ہر چیز کے نشیب و فراز کے متعلق قیاس آرائیوں میں کھو جاتا ہے۔ دراصل مجھ میں قوتِ ارادی کی کمی بھی حساس ہونے کا نتیجہ ہے۔ میں دنیا کی نظروں میں تعلیم یافتہ ہوں۔ میرے پاس دو ڈگریاں اور بے شمار سرٹیفکیٹ اور ڈپلومے ہیں، لیکن میری حالت بالکل اُس بچے کی طرح ہے جسے کھلونوں کی ایک بڑی سی دُکان کے سامنے کھڑا کر دیا جائے اور صرف ایک کھلونا چُننے کے لئے کہا جائے۔ بچے کی نظریں کبھی خوبصورت ہوائی جہاز کی طرف جاتی ہیں جس کے تین ربڑ کے پہیے ہیں اور جو فرش پر نہایت تیزی سے دوڑ سکتا ہے۔ پھر وہ اُس سپاہی کی طرف دیکھتا ہے جو گھٹنے ٹیکے اپنی بندوق چاروں طرف ایک عجیب شان سے گھماتا ہے اور پھر اس کی نگاہیں اس ریل گاڑی میں الجھ جاتی ہیں جو نہایت تیزی سے پٹڑی پر چکر لگا رہی ہے، اس سے مڑ کر وہ ایک چلپچی میں دخانی جہاز کی طرف دیکھتا ہے جو دھوئیں کی لکیر کھینچتا کھٹ کھٹ کرتا پانی میں اِدھر اُدھر دوڑ رہا ہے۔ اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ اس کے ننھے سے ذہن میں دخانی جہاز، برقی گاڑی، بندوق چلاتا ہوا سپاہی اور رنگین ہوائی جہاز ایک بجلی کی طرح کوند جاتے ہیں اور اس کی آنکھیں خیرہ ہوکر رہ جاتی ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ وہ جو کھلونا بھی کہے اُسے اُسی دم مل سکتا ہے وہ پھر ٹھٹکتا ہے، غور کرتا ہے، چاروں کھلونوں کی خوبصورتی پر نظر ڈالتا ہے لیکن کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔

مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس قدر تعلیم کے مجھ میں اور اس بچے میں کوئی فرق نہیں۔ ہم دونوں ایک ہی مرض کے شکار ہیں۔ مستقبل کی قیاس آرائیاں مجھے بھی فیصلہ کرنے نہیں دیتیں۔ میں سوچتا ہوں اور میرا سوچنے بوجھنے والا دماغ مجھے خیالات کی پیچیدگیوں میں اُلجھا کر رکھ دیتا ہے۔ میرے ذہن میں خفیف سا پردہ لہراتا رہتا ہے اور اس سے پرے مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اس پردے کی مہین جالی میں سے مجھے مستقبل کی خفیف جھلکیاں سی دکھائی دیتی ہیں جنہیں یہ پردہ جلد ہی ڈھانپ لیتا ہے۔ یہ سب اس لئے نہیں کہ مجھ میں خود اعتمادی کی کمی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں جو بھی راہ منتخب کروں گا مجھے اُس میں ضرور کامیابی ہوگی۔

پھر کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں ایک گنوار ہوتا۔ ایک کم پڑھا لکھا شخص جو سوچتا کم اور عمل زیادہ کرتا ہے، جس کے لئے زندگی کبھی بھی اپنے ہاتھ پھیلائے سائن پوسٹ کی طرح دوراہے، سہ راہے یا چوراہے کی شکل میں نہیں کھڑی ہوتی، جس کے لئے صرف ایک راہ ہے اور اُسے معلوم ہے کہ اُسے ہر صورت میں اسی راہ پر ہی چلنا ہے۔ کاش کہ میری زندگی میں ایک ایسا تند طوفان آئے جو ان خیالات کے جالوں کو اپنے ساتھ اڑا کر لیجائے یا پھر میری قوتِ ارادی اس زور سے چٹکے کہ میرے دماغ کا پردہ اس کی گرمی سے دم بھر میں پگھل کر رہ جائے یا پھر میرا ذہن اس قدر بے حس ہو جائے کہ میری دماغی حس بالکل شانت ہو جائے اور یا پھر میرے ذہنی ایوان ایک نئی موسیقی سے گونج اٹھیں تاکہ یہ پھنکارتے ہوئے ناگ چپ چاپ سو جائیں۔

خاموشی رات کو نگلے جا رہی ہے۔ چاند کی نوکیلی کرنیں دھند کی ہلکی چادر کو پھاڑنے کی ناکام کوشش کر رہی ہیں۔ سردی ہر لمحہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ تم میری طرف متوجہ نظروں سے دیکھ رہی ہو۔ میں جانتا ہوں تمہارا ذہن کیا سوچ رہا ہے۔ تمہیں میرے ساتھ انتہائی ہمدردی ہے۔ تمہاری نظروں میں پیار اور رحم کا جذبہ لہرا رہا ہے۔ تم یہی سوچ رہی ہو نا کہ میں ان ذہنی کشمکشوں سے نجات پا جاؤں۔ میرا سوچنے بوجھنے والا دماغ سو جائے۔ میرا اُبلتا ہوا دماغی لاوا ٹھنڈا پڑ جائے، میری قوتِ احساس مرجائے تاکہ میں امن اور چین کی زندگی بسر کر سکوں اور اپنے لئے صحیح راستہ تجویز کر سکوں۔ شاید میں بھی یہی چاہتا ہوں ..... لیکن نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا جس روز انسان میں قوتِ احساس مر جائیگی، سوچنے سمجھنے والا دماغ بیکار ہو جائیگا اُس روز انسانیت نیست و نابود ہو جائیگی۔ ہم اپنے آپ کو انسان کہلانے کے قابل نہ رہیں گے۔ ہم پہلے ہی چلتے پھرتے انسان لوہے کی کلیں بن چکے ہیں۔ ہمیں زندہ رہنے کی ضرورت ہے۔ قوتِ احساس ہی انسانیت کا دوسرا نام ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر انسان میں قوتِ احساس اس قدر بڑھ جائے تاکہ وہ دوسروں کی مصیبتوں کا صحیح اندازہ لگا سکے۔ وہ ہر چیز دوسروں کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا سیکھ لے۔ جس روز ایسا ہو جائیگا اس روز دنیا کی لڑائیاں اور جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ خود غرضی کے دور دورہ کا خاتمہ ہو جائیگا۔ انسان صحیح معنوں میں انسان بن جائیگا۔ قوتِ احساس امر ہے، اسے امر رہنے کی ضرورت ہے۔

میں اپنی پیشانی پر تمہارے ملائم ہاتھوں کا لمس محسوس کر رہا ہوں۔ یہ آہستہ آہستہ میری ذہنی الجھنوں کو جذب کر رہا ہے مجھے اپنے ذہنی ایوانوں میں احساسات کی موجوں کا شور مدھم ہوتا سنائی دے رہا ہے، اور میرا ذہنی دھواں جیسے منجمد ہو کر آہستہ آہستہ نیچے بیٹھ رہا ہے۔ میں اپنی پیشانی پر شبنم آلود گھاس کی طرح تمہارے گرم گرم ہونٹوں کی راحت بخش نمی محسوس کر رہا ہوں۔ تمہارے نرم نرم ہاتھ مجھے تھپکیاں دیکر کہہ رہے ہیں، سو جاؤ ——— سو جاؤ ——— سو جاؤ ———

بقیہ۔ کوکھ جلی
اور مجھے اب محسوس ہوا جیسے پاس میں الماری پر رکھی ہوئی ابا میاں کی زنگ آلود وہ بندوق سے یکے بعد دیگرے سات نکلیں اور ٹھائیں ٹھائیں کی آواز بلند کرتی ہوئیں میرے ساتوں بہنوں کے سینوں میں سٹ سے پیوست ہو گئیں۔!

اکو اب تک ہنس رہی تھی اور باہر سے آواز آرہی تھی ؎

"سو جا میری لاڈلی سو جا"

ہماری ادبی تحریک

۲۴، جنوری کو حلقۂ ارباب فکر کا جلسہ دس بجے صبح انجمن وطن ہال میں شروع ہوا۔ جلسہ کی صدارت منظر سلیم نے کی حسب سابق سکریٹری نے پچھلے جلسہ کی رپورٹ پڑھی۔ رپورٹ کے بعض حصوں پر سرشار نے توجہ دلائی جن کی تصحیح کر دی گئی۔ اس کے بعد شاد نے اپنی نظم "ذرے" سنائی۔ اس نظم میں شاعر نے ان پامال انسانوں کی جد وجہد اور مستقبل کا اشارہ کیا تھا جن کے لائے ہوئے انقلاب کی آہٹ دنیا کے تمام مظلوموں کے لئے امید کی سرخ کرن سے کم نہیں۔

شاد نے ایشیا کے مختلف حصوں کی جد وجہدِ آزادی کو سامنے رکھ کر تحریکِ آزادی کی ہر منزل، ہر موڑ کی تصویر کشی اور واقعہ نگاری کی تھی۔ اور اس حرکت کو محسوس کرایا تھا جس کے سینے میں کروڑوں دل دھڑک رہے ہیں۔ تاریخ کی رگوں میں گردش کرنے والی ایک تلخ حقیقت پیش کرتے ہوئے جب شاد نے کہا۔

انہیں ذروں نے سنوارا رخِ گیتی کا جمال　　　انہیں ذروں نے جلائے ہیں تمدن کے دئے

"اور یہ بے چارے خزاں رنگ وزبوں حال رہے"

تو اس وقت نظروں کے سامنے وہ پورا تمدن آگیا جس کی تہذیب کے چہرے پر لگی ہوئی سرخی خونِ آدم کی ارزانی کا ثبوت تھی۔ شاعر نے ہمیں ایک صداقت اور ردِ عمل سے روشناس کراتے ہوئے کہا۔ اب وہ انگلیاں ٹوٹنے والی ہیں جنہوں نے صدیوں تک محنت کشوں اور آزادی کے متوالوں کا گلا گھونٹا ہے۔ دنیا کے بندھن ٹوٹ رہے ہیں اور طبقاتی تقسیم حرفِ غلط کی طرح مٹ رہی ہے۔ انسانیت اپنے عروج پر پہنچنے والی ہے۔

منظر سلیم نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے اس شعر

کون اس بڑھتے ہوئے سیل کو روکے بڑھ کر　　　کس میں جرأت ہے کہ یہ ناچتے کوندے پکڑے

کے متعلق کہا کہ کوندوں کے ساتھ ناچنے کا التزام بہتر نہیں۔ ناچ کے ساتھ ایک خاص نرم اور لچکیلا تصور وابستہ ہے جس کی موجودگی میں کوندے کی شدت کا اظہار پورے طور پر نہیں ہوتا۔ ابھی تک ناچ کے اس نرم تصور میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا، اس لحاظ سے ہمیں لسانی قیود کا اس حد تک احترام کرنا چاہیئے، جب تک ہمارا شعور کسی نئے تغیر کو قبول نہیں کرتا۔

کمال احمد صدیقی:۔ ہم ناچ سے "تانڈو" کا ناچ کیوں نہ سمجھیں جس میں شدت اور خروش کا اظہار ہوتا ہے اور اس تصور کے ساتھ شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے۔

ساحر نے اس شعر　　　پھولتے پھلتے رہے شاہ و پیمبر کے چمن　　　اور یہ بے چارے خزاں رنگ وزبوں حال رہے

میں شاہ و پیمبر کی وضاحت چاہی۔

شاد۔ ہندوستان میں شاہی عروج کے غلط تصور اور مذہبی اقتدار کے زیر اثر جو فرقہ وارانہ ہلاکتیں معرضِ وجود میں آئیں اس کے لئے ملک کا امارت پسند اور مذہبی گروہ ذمہ دار ہے جس نے انسان میں نیکی اور صداقت جگانے کی کوشش نہیں کی۔

سرشار۔ نے ایک بند میں بر و بحر پر کہا کہ بر کا استعمال بغیر تشدید جائز نہیں۔

شاد۔ یہ اعتراض لسانی حیثیت سے قابلِ قبول ہے۔

کمال نے اس بند
انہیں ذروں کے درخشندہ لہو کی سُرخی — ہر نئے چاند کی روداد کا عنوان بنی
کبھی چمکاتی رہی مذہب و رنگت کے ضمیر — اور کبھی تخت کی تزئین کا سامان بنی

میں مذہب و رنگت کے متعلق کہا کہ مذہب و رنگ جب ایک خاص مفہوم و معنی کیلئے استعمال ہوتا ہے تو شاعر نے مذہب و رنگت کیوں نظم کیا۔

منظر سلیم۔ مذہب و مذہبیت سے قطع نظر رنگ و رنگت میں کوئی فرق نہیں۔

کمال۔ ہر لفظ کے خاص ٹرمس (Teems) ہوتے ہیں جن کا احترام ضروری ہے۔

شاد نے اس کے جواب میں کہا، رنگت کا استعمال اس طرح بھی مروج ہے۔ اور اس نے مثال کے طور پر مختلف شعراء کے مصرعے بھی پیش کئے۔

منظر سلیم۔ شاعر نے ایک بند میں

اور اب جبکہ نئی صبح کی زریں ضو سے — تیرگی ختم ہوئی نیند کا جادو ٹوٹا

کہا کہ نئی صبح اور سحر کی آمد کا تذکرہ جس طور پر کیا ہے وہ فی الواقعہ صحیح نہیں۔ یہ تصور کہ نئی صبح اس نام نہاد آزادی کے ساتھ آچکی ہے، بالکل سرمایہ دارانہ پروپیگنڈہ ہے ورنہ ہم اس وقت بھی تاریکی میں گھرے ہوئے ہیں۔

شاد۔ میں نظم کہتے وقت اس فضا سے متاثر ہوا ہوں جو چین، برما، اور انڈونیشیا میں عوام کے جذبۂ آزادی کے ساتھ پیدا ہو چکی ہے۔ یہ تمام ممالک ایشیا میں ہیں، اس لحاظ سے عوام کا شعور بیدار ہو چکا ہے اور انہیں اپنی صحیح اقدار کا احساس ہو چکا ہے۔ یہی اختتامِ ظلمت اور مسکراتی ہوئی سحر کی اولین نشانی ہے۔

نظم اپنے تاثر اور موضوع کے لحاظ سے کافی پسند کی گئی۔

اس کے بعد فیض عراف نے اپنا مقالہ "جنسی ادب میں فراری رجحانات" پڑھا، جسمیں اس نے اس انحطاط پذیر گروہ کو متنبہ کیا تھا جو ادب کو اپنی تحریروں کے ساتھ ایک مریضانہ ذہنیت بخش رہے ہیں لیکن کسی صحت مند اور صالح رجحان کے آئینہ دار نہیں جن کے نزدیک ادب اور حیاتِ انسانی کا تعلق بہت مبہم ہے۔

منظر سلیم۔ اگر مقالہ نگار ان ادیبوں کا تذکرہ بالتفصیل کر دیتا جو اس نراج اور انحطاط کے ذمہ دار ہیں تو مقالہ کی افادیت اور زیادہ بڑھ جاتی۔

شاد۔ یہ کمی بہت زیادہ محسوس ہو رہی ہے اس لئے کہ ان خامکار ادیبوں کا تذکرہ زیادہ تفصیل سے ہونا چاہیئے۔ جو ادب اور سماج کے رشتے کو نہیں مانتے اور حیات افروز ترقی پسند ادب پیش کرنے کا دعویٰ پیش کرتے ہیں۔

اس کے بعد "دستور" پیش ہوا۔ مختلف دفعات پر بحث ہوئیں اور اکثر ترمیمیں قبول کر لی گئیں۔ اور یہ طے ہوا کہ ۶، فروری کو سالانہ انتخاب ہوگا۔

۶، فروری کو انجمن وطن ہال میں حلقہ ارباب فکر کا پندرہ روزہ اجلاس دس بجے صبح زیر صدارت سردار راجونت سنگھ رانا منعقد ہوا۔

سابقہ جلسہ کی رپورٹ کے بعد احمد پاشا نے اپنا مقالہ "ادب میں ـــــ انانیت" پڑھا۔ مقالہ نگار نے "انانیت" کو ادب کے لئے بڑی ضروری اور اہم چیز بتایا۔ مقالہ نگار کے خیال میں "انانیت" سے ابتدائی طور پر جو نقصان پہنچا ہے وہ ادبِ لطیف میں ٹیگور اور نیاز فتحپوری کی غلط تقلید اور صحیح وجدان کی کمی سے تھا، ورنہ انفرادیت کے دوش بدوش "انانیت" ادب کے لئے ناقابلِ انکار ضرورت ہے۔

مقالہ موضوع کے لحاظ سے مختصر اور تشنہ تھا۔

نریش کمار شاد نے احمد پاشا سے اختلاف ظاہر کرتے ہوئے کہا:۔

مضمون کے ابتدائی حصہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "انانیت" نے ادب کو نقصان پہنچایا اور آخری حصہ میں مقالہ نگار "انانیت" کو ادب کے لئے انتہائی ضروری بتاتا ہے، جس سے اجتماع تضاد ہو جاتا ہے۔

احمد پاشا۔ انانیت نے ادب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی وجہ محض غلط تقلید اور ادیب کے تصور کی خامی تھی جیسے ادب برائے ادب کی تحریک میں۔

شاد۔ ادب برائے ادب یا کسی اور ادب میں سہی بہر حال انانیت نے ادب کو نقصان پہنچایا۔ انانیت سے کسی ایسے ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی جو عوامی اور افادی ہو۔

احمد۔ انانیت کی افادیت کے سلسلے میں میکسم گورکی کی سرگزشت پیش کی جا سکتی ہے جو تمام تر انانیت سے لبریز ہے۔

شاد۔ گورکی میں انانیت نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کے ذہن میں انانیت کا مطلب واضح نہیں ہے۔ اور پھر ٹیگور نے جو ادب لطیف پیش کیا ہے اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے ادب اور عوام کے رشتے کو فراموش کر دیا ہو، ادب لطیف میں نیاز فتحپوری نے بھی کوئی اہم حصہ نہیں لیا بلکہ انہوں نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ مختلف حیثیتوں سے یونانی دیومالا اور فارسی کا مطالعہ تھا۔

ساحر۔ مقالہ نگار جسے ادب لطیف کہکر تذکرہ کر رہا ہے وہ دراصل ادب لطیف نہیں بلکہ "لطیف تر ادب" تھا اور ادب کی ایسی صنف تھی جو قطعاً غیر افادی اور مایوس کن تھی۔ اسی وجہ سے یہ صنف وقت سے پہلے ختم ہو گئی۔ ٹیگور کا ادبِ لطیف

اس سے قطعی مختلف اور الگ چیز تھا۔

بحث کافی طویل ہو کر الجھتی جا رہی تھی اور احمد پاشا یہ کہہ رہے تھے کہ اختلاف نظریاتی اور بنیادی ہے اس لئے بحث صحیح نہیں ہے۔ اس لئے یہ تجویز پیش کی گئی کہ بحث کو اسی جگہ ختم کرتے ہوئے یا تو دوسری مجلس میں اسی موضوع پر مباحثہ کرا لیا جائے یا پھر احمد پاشا اپنی وضاحت کے لئے دوسرا طویل اور سیر حاصل مضمون لکھ کر لائیں تاکہ غلط فہمی اور تضاد کا خاتمہ ہو سکے۔ بحث ختم کر دی گئی۔ اس کے بعد فرحت کانپوری نے اپنی نظم:-

"میں کہ دامن کشِ نیرنگِ جہاں ہوں اے دوست"

سنائی۔ نظم ہر جہت سے کامیاب تھی جسے بیحد پسند کیا گیا۔ اس نظم میں شاعر نے مختلف تحریکوں اور سرگرم عمل قوتوں کا اشارۃً تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ برسرِ اقتدار اور موجودہ ماحول میں پرولتاری طبقہ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ عوامی فتح کے نام پر جو تسلی دی جا رہی ہے وہ خام ہے۔

اس کے بعد تمام ممبروں کی رائے کے اظہار سے حسب ذیل انتخاب عمل میں لایا گیا۔

جنرل سکریٹری	فیض عراف
جوائنٹ سکریٹری	راجونت سنگھ رانا
پروپیگنڈہ سکریٹری، خازن	عبدالرزاق قریشی

مجلس منتظمہ میں علاوہ ان تین اراکین کے نریش کمار شاد اور فرحت کانپوری منتخب ہوئے۔

تمام انتخاب باتفاق آرا اور بلا مقابلہ ہوا۔

ان میٹنگوں میں شریک ہونے والوں میں منظر سلیم۔ کمال احمد صدیقی۔ فرحت کانپوری، نریش کمار شاد ثاقب کانپوری۔ ساحر ہوشیارپوری۔ احمد پاشا۔ ادریس احمد۔ کرشن لال راز۔ ممتاز دانش۔ کے۔ ایس گیانی۔ عبدالرزاق۔ رجونت سنگھ رانا۔ اور غلام ربانی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ہماری نظر میں

نیا چین

ناشر:- قومی دارالاشاعت۔ سینڈھرسٹ روڈ۔ بمبئی ۴

مترجم:- کلیم احمد۔ قیمت ایک روپیہ ضخامت ۸۰ صفحات

یہ چھوٹی سی کتاب دراصل امریکہ کی مشہور ادیبہ "رینالوئی اسٹرانگ" کی تصنیف "ڈان آؤٹ آف چائنا" کا آزاد ترجمہ اور خلاصہ ہے۔ ریناوئی نے خود کئی سال چین میں رہ کر وہاں کے عوام کی معاشی، سیاسی اور تمدنی زندگی کے بارے میں اپنے تاثرات وتجربات کو نہایت واضح اور مدلل انداز میں قلمبند کیا ہے۔ اور کلیم احمد صاحب نے ریناوئی کی تصنیف کے کچھ اہم حصّے اور بعض حصوں کا ضروری اختصار نہایت تسلسل اور وضاحت کے ساتھ زیرِ نظر کتاب میں پیش کیا ہے۔ جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے کلیم صاحب اپنی کوشش میں کافی کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب نہایت صاف رواں اور عام فہم ہے اور اردو خواں طبقے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت حد تک مؤثر اور مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

چین کی سرزمین کے سینے پر کتنے ہی سالوں تک تباہ حالی اور قحط کے گھناؤنے پھوڑے رستے رہے ہیں۔ وہاں کے اَن پڑھ عوام سالہا سال تک فاقوں۔ وباؤں اور توہمات کا شکار ہو کر نہایت روتی کراہتی زندگی گزارتے رہے اور وہاں کی تہذیبی اور تمدنی پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ وہاں کی عورتیں شوہروں کے ہاتھوں فروخت کر دی جاتی تھیں اور ان کے پاؤں آہنی جوتوں سے جکڑ دئے جاتے تھے تاکہ وہ کہیں باہر آنے جانے کے قابل نہ رہیں۔ وہاں کے محنت کش کسانوں کو جھونپڑے بھی میسر نہیں تھے۔ اور وہ کیڑے کوڑوں کی طرح تنگ وتاریک متعفن غاروں میں رہنے پر مجبور تھے۔ اگر کسی کسان کی شادی ہوتی تو دلہن کے لئے یہ ضروری ہوتا کہ وہ پہلی رات کسی جاگیردار کے ہاں بسر کرے لیکن کنفیوشسس کی اسی دھرتی کی جنتا آج ایک پھن کچلے ہوئے ناگ کی طرح بیدار ہو چکی ہے آج وہاں کی عورتوں کو اپنے پورے سماجی حقوق حاصل ہیں اور وہ اپنی جمہوری جنگ میں عملی حصّہ لے رہی ہیں۔ آج وہاں کا کسان اپنا حق پہچان چکا ہے اور عوامی قوتوں کے دوش بدوش چیانگ کے سامراجی نظام کی لاش پر ایک نئی اور خوشحال سماج کی تشکیل کر رہا ہے۔ لیکن یہ انقلاب اچانک یا اتفاق سے نہیں آگیا بلکہ کیمونسٹوں کی مسلسل بارہ سالہ جدوجہد کا نتیجہ ہے جس کے دوران میں انہوں نے کڑے سے کڑے مصائب جھیل کر وہاں کے مالی مسائل کو سلجھایا۔ تعلیم کو عام کیا۔ کسان سبھائیں بنائیں۔ زرعی اصلاحات کیں۔ اور وہاں کے عوام کو ان کے اصلی اور گھر کے دشمن کے خلاف منظم کیا اور اسی قسم کی دوسرے اہم امور جن سے چین کے اس جمہوری انقلاب کے پس منظر کو سمجھنے میں امداد ملتی ہے اور جن کا سمجھنا بہت ضروری ہے اس مختصر سی کتاب میں تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ (شاد)

جاں نثار اختر کے ایک سو ایک شعر

مرتبہ وجد چغتائی۔ ناشر وجد چغتائی۔ مغلیہ منزل۔ لشکر گوالیار
پاکٹ سائز صفحات ۳۲ قیمت ۴ر

جاں نثار اختر فطرت کی طرف سے شاعرانہ شعور لیکر پیدا ہوئے ہیں۔ انکی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی۔ اُن کے والد جناب مضطر خیر آبادی کی غزلیات سے کون واقف نہیں ہے۔ مضطر غزل کے آسمان پر ایک چمکدار ستارے کی طرح نمودار ہوئے اور اپنے ہی سوز پنہاں میں جل کر ہماری نظروں سے پوشیدہ ہوگئے۔ جاں نثار اختر کی شاعری میں مضطر کا سارا اضطراب موجود ہے، مگر وہ "تنگنائے غزل" میں اپنے آپ کو محدود نہ کرسکے اور ترقی پسند ادب کا ساتھ دینے کے لئے نظم کا میدان اپنے لئے منتخب کیا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جو بات اُن کی نظموں میں ہے وہ غزلیات میں نہیں پائی جاتی۔ وجد چغتائی صاحب نے ۴ صفحات کا پیش لفظ سپرد قلم کیا ہے۔ اور یہ غزلیات کے اشعار کا مختصر سا مجموعہ خود غزل کی جھلملاتی شمع کے نام انتساب کیا گیا ہے۔ جاں نثار اختر کی زندگی ایک ناکام محبت کی زندگی ہے۔ وہ اشعار میں اپنی آپ بیتی بیان کرتا ہے۔ وہ شعر اپنے لئے کہتا ہے یا پھر ——— انجم، گلنار اور ناہید کو سنانے کے لئے ——— دوسرے اشخاص سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔ اسی لئے اس کی غزلوں میں یاس و حرماں کا ایک دلسوز منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے ہم اس میں محو ہوجاتے ہیں۔ چند اشعار اس نوعیت کے ملاحظہ ہوں۔

دُور کوئی رات بھر گاتا رہا — تیرا ملنا مجھ کو یاد آتا رہا
اس طرح کچھ اس نے چھیڑا دل کا ساز — دیر تک ہر تار تھراتا رہا
ہم نہ آئے پھر چمن میں لوٹ کر — موسم گل بار بار آتا رہا

کیا کہئے کہ کیا کیا بادل سے بجلی کے اشارے ہوتے ہیں
وہ بال بکھیرے جب میرے بازو کے سہارے ہوتے ہیں

داماں افق رنگین ہوا، خون شب عشرت ہوتا ہے
ہم تجھ سے ہمیشہ کو رخصت اے صبح کے تارے ہوتے ہیں

ابھی گناہ سے باقی ہے کچھ حجاب مجھے — دل خراب ذرا اور کر خراب مجھے

مجھ کو خود اپنی جوانی کی قسم ہے کہ یہ عشق — اک جوانی کی شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں

میری دنیا تیرے مہر و ماہ کی بھوکی نہیں — داغ دل رکھتا ہوں میں داغ جگر رکھتا ہوں میں

یہ درست ہے کہ جاں نثار اختر کی غزلوں میں وہ بات نہیں پائی جاتی جو اُن کے ہم عصر شعراء یعنی مجاز اور جذبی کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے لیکن پھر بھی وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

(مبشر علی صدیقی)

ماہنامہ کائنات

جنوری ۴۹ء ضخامت ۵۶ صفحے۔ قیمت ۸؍ سالانہ پانچ روپے

ملنے کا پتہ:- ۲۴۱۹/E سوہا بازار لاہور

ماہنامہ کائنات اُردو کے کہنہ مشق صحافی غلام محمد کی ادارت میں امرتسر سے شائع ہوتا تھا۔ تقسیم پنجاب کے بعد انہوں نے اُسے لاہور سے دوبارہ جاری کیا ہے۔ زیر نظر شمارہ اس کے دورِ جدید کا تیسرا پرچہ ہے۔ جس میں نئے اور پُرانے لکھنے والوں کی منظوم و منثور نگارشات شامل ہیں۔ سرورق نہایت دیدہ کش اور کتابت و طباعت صاف ستھری ہے۔ فراق گورکھپوری، نریش کمار شاد اور فارغ بخاری کی منظومات، خاطر غزنوی کا افسانہ اور مظفر حسین شمیم کا فلمی مقالہ دامنِ کائنات کی زینت و زیبائش ہیں۔

آغاز میں چند تعریفی خطوط اور ایک منظوم تہنیتی پیغام درج ہے۔ ذاتی نوعیت کے باعث ان کا شامل نہ کرنا ہی بہتر ہوتا۔ افسانے اور مقالے بھی ادبی معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ آخر میں دو صفحوں پر فلمی خبریں پھیلی ہوئی ہیں جن کی اشاعت کا مقصد غیر واضح ہے۔ یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ جنوری نمبر پہلے دو شماروں سے نسبتًا بہتر ہے اور ترتیب میں ایک سلجھاؤ آشکار ہے۔ لیکن اس انتشاری دور میں اُردو کے جرائد و رسائل مبہم اور غیر افادی پالیسی پر عمل کر کے کسی صورت بھی اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ مدیرِ کائنات بھی اپنے لئے تعمیری اور صحت مندانہ روش اختیار کر کے زبان و ادب کی خدمت اور عوام کی صحیح رہنمائی کریں گے۔

(ساحر)

ماہنامہ بانو

ضخامت ۲۷۶ صفحے مرتبہ زیب انور

ملنے کا پتہ دفتر ماہنامہ بانو دہلی قیمت ڈھائی روپے

حسین کشیدہ کاری نمبر

ماہنامہ بانو نے قلیل مدت ہی میں قابلِ رشک کامیابی حاصل کر کے اپنے قارئین کا ایک خاص حلقہ پیدا کر لیا ہے۔ "خاص نمبر" کے جلد بعد ہی اس کا "حسین کشیدہ کاری نمبر" بھی ہر طرح کامیاب و جاذب نظر ہے۔ سرورق حقیقتًا حسین اور معنی خیز "پیش لفظ اور اظہار تشکر" کے ڈیڑھ صفحے کے علاوہ باقی تمام صفحات پر سادہ و رنگین نمونوں کا ایک دل کش جال بچھا ہوا ہے، اور ان کے پیش کرنے والے حضرات خواتین کا نام بھی درج ہے۔

تارکشی، سٹینل ورک، کٹ ورک، سویٹر، بنیان، موتیوں کے فریم اور بارڈر سلمے ستارے کا کام غرضیکہ کشیدہ کاری اور بُنائی کے ہر جہت کا اسلوب اس حسین و جمیل نمبر کی زینت ہے۔ غالبًا اس صنف میں اس سے بہتر اور ارزاں تر کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔

اُردو اور انگریزی حروف کے نمونوں کی موجودگی میں ہندی حروف کا نہ ہونا ضرور کھٹکتا ہے۔ اگر ان کے چند نمونے بھی شامل کر لئے جاتے تو اس نمبر کی افادی حیثیت میں اور اضافہ ہو جاتا۔

(ساحر)

اور فن کاروں نے لکھا

حیدرآباد دکن

مکرمی!

چندن کا خاص نمبر موصول ہوا۔ دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔ بہت ہی دلچسپ اور معیاری خاص نمبر آپ نے شائع فرمایا ہے جو ہر لحاظ سے مرصع ہے۔ چندن کو آسانی سے ہندوستان کا بہترین رسالہ کہا جا سکتا ہے۔ آپ دونوں کی کوشش قابل داد ہیں اور ان سے سر تیج بہادر سپرو کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی ناقابل تقسیم میراث ہے۔

مکرمین
عزیز احمد

●　●

چندن کا سالنامہ محاسن ظاہری و معنوی کا قابلِ قدر مرقع ہے۔ میں نے اسے اول سے آخر تک پڑھا۔ دماغ ابتک اس الجھن میں ہے کہ یہ فن کاروں کی سحر نگاریاں ہیں یا ساحر کی ساحری۔ مجھے یقین ہے کہ سالِ حال کے سالناموں میں کوئی سالنامہ اس کا مدمقابل نہ ہوگا۔ نکر تونسوی۔ ممتاز شیریں کے مضامین بہت ہی قابلِ داد ہیں وہ مضمون بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے جو ایک مکتوب کی صورت میں دوزخ سے لکھا گیا ہے۔ حصۂ نظم میں بھی کئی چیزیں قابلِ ستائش ہیں۔ ادارہ اپنی کامیاب مساعی کے لئے بلاشبہ مبارک باد اور تحسین کا مستحق ہے۔

جوش ملسیانی

●　●

چندن اپنے جنم دن ہی سے اپنی خوبصورتی اور خوش سیرتی سے حسن ہیں نظروں کا مرکز بننا شروع ہو گیا تھا۔ اعلیٰ کتابت، خوبصورت طباعت، اور چکنے سفید کاغذ اور جاذبِ نظر سنجیدہ سرورق نے ہر لکھنے اور پڑھنے والے کا جی لبھایا۔ دھیرے دھیرے سبھی اچھا لکھنے والے اس میں لکھنے لگے اور پڑھنے والوں کی میز پر چندن نظر آنے لگا۔

آج میرے ہاتھوں میں چندن کا سالگرہ نمبر ہے۔ اپنی روایتی شان کو برقرار رکھے ہوئے۔ طباعت معقول، کتابت خوبصورت۔ ضخامت، کاغذ اور حسین سرورق دیدہ زیب۔ مضامین کی فہرست پر نظر پڑتی ہے تو کوئی ہی اچھا لکھنے والا رہ گیا ہوگا۔ سبھی تو نظر آتے ہیں۔

نظموں میں مخمور جالندھری کی نظم اپنی جدید تکنیک اور موضوع کی تازگی کے اعتبار سے خوب ہے۔ مخمور کا گہرا مشاہدۂ حیات اور فن کارانہ صلاحیت اس نظم میں پورے طور پر موجود ہے۔ وہ سماج کے موجودہ نظام اور اس کے گھناونے رستے ہوئے ناسوروں سے نفرت کرتا ہے اور دوسروں کو کسی قیمت پر بھی ان کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا۔ چاہے اس کو اس میں اپنی موت ہی کیوں نہ نظر آئے۔

کیفی اعظمی نے "پامسٹ" میں ہماری سماج کی بوڑھی عصمت کی دیوی پر بھرپور طنز کیا ہے۔ وہ اسے اور بھی اُبھار سکتے تھے مگر یہ مضمون پابند نظموں میں نہیں سما سکتا اور کچھ ان کا ذہن اور تجربہ بھی ساتھ نہیں دیتا۔

نریش کمار شاد کی نظم "سراب" اپنے موضوع اور مصرعوں کے حسن کے کارن ذہن سے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ موضوع

اور خیال اس قدر جامع ہیں کہ یہ خوبصورت طنز ہر کہیں کامیابی سے چسپاں ہوتی محسوس ہوتی ہے۔

سید احتشام صاحب کا مقالہ اگرچہ مختصر ہے اور جلدی میں لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن انکی غیر جانبدارانہ تنقید یہاں پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ قبلہ جوش ملسیانی کا مضمون اپنی افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے خاص چیز ہے۔ احسن فاروقی صاحب کا مقالہ بھی محنت اور مطالعہ کا مظہر ہے۔ لکھنے والے کا مذاق سلجھا ہوا اور انداز خوب ہے۔ رائے بھی بے لاگ ہے۔ اسی طرح ممتاز حسین کی تنقید بھی خوب ہے۔

تاجور سامری

● ●

جھانسی

۳، فروری ۱۹۴۹ء

مکرمی جناب شاد صاحب!

چندن کا سالنامہ دیکھا۔ بہت پسند آیا۔ آپ کی اور ساحر صاحب کی دو ماہ کی محنت ٹھکانے لگی۔ مضامین اور نظموں کی ترتیب میں کاوش سے کام لیا گیا ہے اور شروع سے آخر تک ایک خاص سلیقے کا اظہار ہوتا ہے۔ عبادت بریلوی کا مضمون خاص طور پر قابل توجہ ہے اور سالنامہ میں اس کو شامل کر کے آپ نے اپنی وسعتِ نظر کا ثبوت دیا ہے۔ افسانے اور نظمیں معیاری ہیں اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یو۔پی کے اُردو رسائل میں چندن کا اس سال کا سالنامہ بہترین ہے۔

خیر طلب
بشیر علی صدیقی

● ●

مالیگاؤں

۷، فروری ۱۹۴۹ء

بھائی ساحر

سالنامہ کی اشاعت ہر اعتبار سے ایک یادگار اشاعت ہے۔ افسانوں میں اگرچہ قریبی حالات کی تصویریں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں لیکن ان کو اتنی چابک دستی سے پیش کیا ہے کہ لکھنے والوں کی فن کی عظمت کا ایک گہرا نقش دلوں پر جم جاتا ہے۔

نظموں میں ویسے تو کئی اچھی ہیں لیکن شاد بھائی کی نظم اپنی فنی خوبیوں کے باعث شاہکار نظر آتی ہے۔ وہی بات جس کو ڈیڑھ سال کے عرصے میں کم از کم ڈیڑھ سو لکھنے والوں نے دہرایا ہوگا۔ شاد نے ایک ایسے اچھے اور نفیس انداز سے پیش کیا ہے کہ کم از کم میں تو ابتک اس ہوشیاری پر سر دھن رہا ہوں۔

کشمیری لال ذاکر کا افسانہ جیسے ایک تشنگی اور خلا پیدا کر دیتا ہے۔ ایم شکیل نے دوزخ سے عجیب و غریب پیرائے میں حالات کا جائزہ لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں سالنامہ میں اگر یہ تخلیق شامل نہ ہوتی تو بہت بڑی کمی تھی۔

خوشی اسکی ہے کہ ایک ایسا سرمایۂ ادب آپ حضرات نے پیش کر دیا جو زبان و ادب دونوں کے لئے باعثِ ناز ہے۔ مخلص،۔ ادیب مالیگانوی

ملیح آبادی

7.2.49

پیارے شاد

سالنامہ اتنا حسین اور دلکش ہے کہ تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے سالنامہ عہدِ حاضر کے رسائل میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ تمہاری اور ساحر کی خاموش مگر مخلصانہ کوششیں ہر طرح کامیاب ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تمہاری سلیقہ مندی پر مجھے رشک آتا ہے۔ نظمیں۔ غزلیں۔ افسانے۔ مضامین۔ غرض کس کس چیز کی تعریف کروں ایک سے ایک بہتر ہے۔

تمہاری

اشعر ملیح آبادی

● ●

گوڑگاؤں

پیارے بھائی! محبت

چندن کا سالنامہ ملا۔ شکریہ!

آپ نے ہندوستان میں کئی سالوں کے بعد پہلی بار ادبی جمود کو توڑا ہے۔ اس خشک ماحول میں یہ پہلی کلی ہے جسے چومنے کو جی چاہتا ہے۔ کاش یہ کلی مستقبل قریب میں ایک دلکش پھول بن سکے۔ مقالے۔ نظمیں، افسانے سلیقے سے نبھائے گئے ہیں۔ تصویریں چھاپنے میں فن کار کے ساتھ کسی اچھے نقاد کی رائے شامل کر کے آپ نے ادبی حلقے میں ایک جدّت پیش کی ہے۔

خاکسار

کشمیری لال ذاکر

● ●

راولپنڈی

۱۲؍ فروری ۴۹ء

برادرم شاد صاحب تسلیمات!

چندن کا خاص نمبر ملا، شکریہ۔ یوں تو پورا نمبر صوری و معنوی لحاظ سے خوب ہے۔ لیکن مخمور۔ کیفی۔ کلیم جمیل اور آپ کی نظمیں۔ شاہد نصیر اور منظور کی غزلیں۔ خواجہ احمد عباس۔ بلونت سنگھ۔ ممتاز شیریں۔ کرتار سنگھ دوگل اور کشمیری لال ذاکر کے افسانے بلاشبہ سالنامہ کی جان ہیں۔

مقالے قریب قریب سبھی افادی اور پُراز معلومات ہیں۔ عبادت بریلوی کا مقالہ "اُردو کا مسئلہ" جس خلوص

چندن

اور بے باکی کا آئینہ دار ہے۔ اس سے عبادت صاحب کے صحیح نقاد ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ ہمارے تنقید نگاروں کو اپنی تنقید میں اس بے باکی اور خلوص کا اظہار کرنا چاہیئے تاکہ زندگی کے گرد آلود خطوط زیادہ سے زیادہ نکھر سکیں۔

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ چندن کے سلسلہ میں آپ کی کوششیں ہر لحاظ سے مبارکباد کی مستحق ہیں۔ کیونکہ آپکی کوششوں نے چندن کو صرف چند ماہ میں جس بلند مقام پر پہنچا دیا ہے ہمارے معیاری رسائل اس مقام تک کئی سال کی مسلسل تگ و دو اور جد و جہد کے بعد پہنچتے ہیں۔ خدا آپ کو اور قوتِ عمل عطا فرمائے۔ فقط

مخلص

مضطر اکبر آبادی

● ●

بارہ چکہ

۱۴ فروری ۴۹ء

کرم فرما تسلیم۔

میں نے مجموعی طور پر سالنامے سے بہتر تنظیم کبھی نہیں دیکھی۔ بخدا اس کے تو اشتہارات پڑھنے میں بھی دل لگتا ہے۔ (حد ہو گئی ہے) افسانوی حصہ بہت جاندار ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ خواجہ احمد عباس کی کہانی "رفیق" ہر اس دل کی کسک ہے جو کبھی ایک لمحہ بھی ہندو مسلمان کے علاوہ کسی انسان کے پہلو میں دھڑکا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہب کے سینے پر جو متعفن ناسور ہیں ان کے لئے ہم کو اسی طرح کے نشتر درکار ہیں۔ احمد عباس کا طرزِ تحریر تو جانا پہچانا ہے۔ مگر اس کہانی میں انہوں نے بڑے ہی لاجواب پنچ دئے ہیں۔ بلونت سنگھ کے گرینڈ ہوٹل میں اچھا نفسیاتی تجزیہ پیش ہوا ہے۔ ممتاز شیریں نے اپنی نسائیت کا بڑا عمدہ مصرف کیا ہے۔ "وہ ایک لمحہ" جیسی کہانی ایک عورت ہی لکھ سکتی ہے اور وہ عورت بھی ممتاز شیریں ہی ہو۔ تسنیم سلیم نہیں اس حصے کی باقی چیزیں بھی اچھی ہیں۔ ماننا پڑتا ہے کہ یہ ہندوستان اور پاکستان میں رہنے والے افسانہ نگاروں کا عمدہ انتخاب ہے۔

نظم و غزل میں محض پڑھنے کی چیزیں بہت کم اور بار بار پڑھنے کی چیزیں بہت زیادہ ہیں۔ مقالات کا پلہ بھاری ہے اور یہ کسوٹی ضرورت کے عین مطابق ہے۔

تسنیم سلیم چھتاری

● ●

کراچی ۱۴ فروری ۴۹ء

ساحر بھائی

چندن، ساحر ـــــ اور کانپور!! یہ بامعنی جوڑ دیکھ کر خوشی تو ہوئی لیکن اسکی گہرائیوں پر جتنا غور کرتا ہوں لاینحل مسائل دیوار کیطرح ذہن سے ٹکراتے ہیں۔ چندن کا سالنامہ مل گیا۔ یاد آوری کا شکر گزار ہوں۔ موہوم امیدیں بن جانے پر بھی کوئی ذریعہ تو ہمارے ملاپ کا پیدا ہو گیا ـــــ خدا کرے یہ فضائیں ہمیں سازگار ہوں۔ کانپور میں بیٹھ کر تم نے کافی جرأت اور حوصلے کا ثبوت دیا ہے، اس میں کلام نہیں، میرے دیگر احباب بھی

اس عزم مردانہ پر عش عش کر اُٹھے ہیں۔

چندن کے سالنامے کا ریویو "سب رنگ" مارچ نمبر میں شامل کر رہا ہوں۔ ریویو کا لفظ میں نے غلط استعمال کیا۔ یوں کہیے کہ چندن کو پاکستانیوں میں متعارف کرا رہا ہوں۔

تمہاری حسین کوششوں پہ دوبارہ آفریں کہتا ہوں۔

آپ کا
سید فیضی

پشاور ۱۵ فروری ۱۹۴۹ء

شاد بھیا!

چندن کا سالنامہ ملا۔ میں تمہیں اس کامیاب کوشش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ درحقیقت چندن کو اب تم نہایت بلند مقام تک لے گئے ہو۔ کتابت وطباعت کی دشواری کے باوجود ظاہری اور باطنی محاسن میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ مضامین کی ترتیب میں خوش سلیقگی اور حسن نظر سے کام لیا گیا ہے۔ ترتیب و تدوین بھی قابل ستائش ہے۔

خلوص کار
فارغ بخاری

علی گڑھ ۲۱/ فروری ۱۹۴۹ء

بھائی ساحر!

چندن کا سالنامہ غالباً یوپی کا پہلا یادگار سالنامہ ہے جو نہ صرف اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہاں سے اس قسم کا ایک ضخیم ادبی مجموعہ شائع ہوا بلکہ یہ اس سال کے رواں دواں ادب کی بہترین نمائندگی بھی کرتا ہے۔ اس میں جہاں بڑے بڑے نام نظر آتے ہیں وہاں نئے نئے اچھے لکھنے والوں کی تخلیقات بھی شامل ہیں۔ اور آج کل کے معیاری پرچوں کی صف میں یہ ایک نئی چیز کا اضافہ ہے، کیونکہ اکثر ایڈیٹر مضامین کے انتخاب میں ناموں کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

مضامین میں عبادت بریلوی کا مضمون "اُردو کا مسئلہ" اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ بہت اچھا لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ممتاز حسین کا مضمون "ادب اور حقیقت" اور جوش ملسیانی کا مضمون "شعر میں تخفیف الفاظ" بہت قابل قدر ہیں۔ افسانوں میں خواجہ احمد عباس کا "رفیق" اور فکر تونسوی کا "مخمور جالندھری" اچھی چیزیں ہیں۔ نظموں کا حصہ بہت بلند ہے اور اس دور کی پوری نمائندگی کرتا ہے — موضوع کے اعتبار سے بھی اور فن کے لحاظ سے بھی —

چندن کا یہ سالنامہ صوری لحاظ سے خاص کر لکھنے والوں کی تصویریں اور ان کا تعارف بہت دل کش ہے۔

خلیل الرحمن اعظمی

آسمانی مصائب نازل ہونے پر ہم خدا کا نام لیتے ہیں!
لیکن جسمانی امراض کی تکالیف میں
تیر بہدف ادویات ہی کام آیا کرتی ہیں
مندرجہ ذیل مشہور ادویات کے نام ہرگز نہ بھولیئے:۔
لکشمن دھارا
اس آب حیات کو گھر کا ڈاکٹر سمجھ کر ہمیشہ اپنے پاس رکھئے۔ بدہضمی، کھانسی، زکام، دمہ، ہنگو سینی ہیضہ، متلی، پلیگ۔ بخار، چوٹ، سوجن، زہریلے جانوروں کے کاٹنے غرضکہ ہر مرض اور ضرورت پر فوری اثر دکھانیوالی قیمت بڑی شیشی -/8/1 روپیہ چھوٹی شیشی بارہ آنے
RBC
ویریہ سنجیون ست
مادہ منویہ کی تمام خرابیوں کو دور کرکے اس نادر روزگار دوائی نے بیشمار زندہ درگور مریضوں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ ناکارہ زندگی کو شباب کی امنگوں سے ہمکنار کرنے میں، اس مقوی دوائی نے جو کرشمے دکھلائے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ ایکبار آپ بھی اسے استعمال کرکے مسرت زندگی کے عیش و آرام سے لطف اندوز ہوجیئے قیمت -/5/3 روپیے
روپ بلاس
مہاسے، چھائیاں، چیچک کے داغ اور چہرہ کی تمام بدزیبیاں اس ابٹن سے دور ہو کر رنگ حیرت انگیز طور پر نکھر جاتا ہے۔ محبوبہ کی نذر کرنے کے لئے بہترین تحفہ قیمت دو روپے
ناری سنجیون
حیض کی جملہ خرابیوں کو دور کرکے عورتوں کے تمام مخصوص امراض کے لئے اکسیر، ان کے شباب اور خوبصورتی کو چار چاند لگانے والی بے نظیر دوائی۔ قیمت تین روپے دو آنے -/2/3
نیترو
آنکھوں کی جملہ تکالیف میں جادو کا اثر دکھانیوالی بینائی کو تیز کرنے اور آنکھوں کی حفاظت کے لئے بے بدل دوائی قیمت آٹھ آنے ۸/
بالکو
بچوں کی ہر قسم کی کھانسی، سوکھا روگ، چڑچڑاپن حرارت۔ سبز اور زرد رنگ کے دست۔ غرضیکہ بچوں کے تمام امراض میں بے حد مفید ہے۔ قیمت ایک روپیہ
چیون پراش
آیورویدک کی مشہور مقوی دوائی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بدہضمی۔ نزلہ اور تمام جسمانی کمزوریوں کو دور کرکے کایا پلٹ کرنے میں لاثانی قیمت فی پاؤ دو روپے -/2
رجسولینا
ایام ماہواری کی تمام بے قاعدگیوں کو دور کرکے ویران گھروں کو بچوں کی پیاری پیاری آوازوں سے آباد کرنے والی لاجواب دوائی
قیمت پانچ روپے آٹھ آنے
-/8/5
نوٹ
ڈاک خرچ ہر قیمت پر علیحدہ ہوگا
ملنے کا پتہ
روپ بلاس کمپنی
دھن کٹی۔ کان پور (یو۔پی)

ہند انجنیرنگ ورکس کانپور
دفتر:-
لاٹوش روڈ
کانپور
ہمارے سٹینڈرڈ ٹائپ ایکسپیلر ۲۴ گھنٹے میں
۵ سے ۔ من تک تیل نکالتے ہیں۔
اور برسوں بے رُکاوٹ چلتے ہیں۔
ہمارے کارخانے میں تیل کے ایکسپیلر اور
متعلقہ پرزہ جات وسیع پیمانے پر تیار کیے جاتے
ہیں جن کی ساخت میں ہر قسم کی احتیاط لازم رکھی جاتی ہے
ہزاروں کرمفرماؤں کے تعریفی خطوط ہماری اعلیٰ کاریگری کا ثبوت ہیں۔
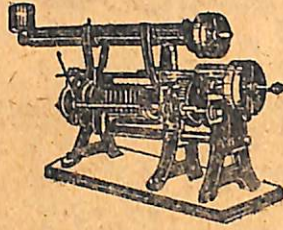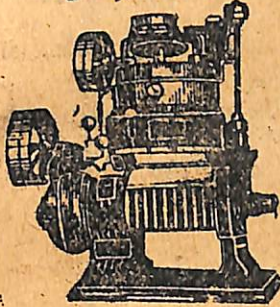
Regd. No. A655

Cover Printed by the Job Press Ltd. Kanpur

چندن
ساحر ہوشیارپوری
نریش کمار شاد